جلد ۹۷ — جولائی ۱۹۸۲ء — عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن
کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے
اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- ○ مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- ○ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ○ سفینۂ نجات — از جمیل احسن ندوی
- ○ تحریک اسلامی کے مراحل — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنے والی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے
خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرائیں:

ادارہ ترجمان القرآن ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اعراض ۱۶۶ موتی چند بلڈنگ، انارکلی، لاہور

مکتبہ ترجمان القرآن ۴۰- اردو بازار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۷	جولائی ۱۹۸۲ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرسالانہ تیس روپے ۔ فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

تعزیت

شاہ فیصل شہید کے اقتدار سے سعودی عرب کا دَور نَو شروع ہوا جس میں اسلامی فکر و معاشرت پر زور دیا گیا، سعودی عرب کی تعلیمی، معاشی اور دفاعی ترقی کو فروغ ملا۔ وحدت اسلامی کی تحریک نے زور پکڑا اور علی الخصوص پاکستان سے گہرے برادرانہ تعلقات کا آغاز ہوا۔

شاہ فیصل ۱۹۷۵ء میں شہید کر دیئے گئے اور ان کی ذمہ داریٔ اقتدار شاہ خالد کے سر آئی جن کی وفات نے مسلمانانِ عالم پر رنج و اندوہ کا ایک غبار پھیلا دیا ہے۔ شاہ خالد نے باوجود خاموش طبع ہونے کے شاہ فیصل شہید کی پالیسیوں کے خطوط کو برقرار رکھا اور سعودی مملکت اور معاشرے کا ارتقا اسی نہج پر ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ شاہ فیصل کی عظیم درویشانہ مگر مدبّر شخصیت کے خلا کو پُر کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ پھر بھی شاہ خالد نے بھرپور کام کیا۔ ان کے دور میں بھی توسیع و تزئینِ حرمین شریفین کا کام زور شور سے جاری رہا۔ ان کے زیرِ اہتمام تیسری عرب سربراہ کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کے ذریعے ۱۹۷۶ء میں لبنان کی خانہ جنگی کا طوفان رُک گیا۔ انہوں نے ترقیاتی ایجنسی اور عالمی مسلم بنک قائم کر کے پسماندہ اور غریب ممالک (خصوصاً مسلم ممالک) کی معیشت کو مضبوط بنانے کی راہیں نکالیں۔ اور اقوام متحدہ کے ٹیکنیکل اسسٹنس بیورو اور اس کے اسپیشل فنڈ میں کثیر رقم دے کر پسماندہ ملکوں کو تکنیکی اور فنی تعلیم کے لئے زیادہ مقدار میں امداد بہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ تیل کی قیمتوں کو اوپیک ممالک کے رجحان کے خلاف محض اس لئے بڑھنے سے روکا کہ اس طرح غریب —— (اور خصوصاً بعض مسلم) ممالک کی معیشت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اندرون ملک صنعتی اور زرعی ترقی کے لئے بہت تیزی سے کام کرایا۔ تعلیم میں بہت توسیع کی اور سعودی طلبہ (نیز بہت سے دوسرے مسلم طلبہ) کی بہت بڑی تعداد کو مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا اور وظائف پر بہت بڑی رقم خرچ کی۔ علاوہ ازیں مغربی، افریقی اور دیگر ممالک میں اسلامی سینٹر اور مساجد اور تبلیغی ادارے قائم کرنے کی صورت میں بڑی خدمات انجام دیں سعودی حکومت کے خرچ پر جگہ جگہ معلمین اور مبلغین کا تقرر کیا جاتا رہا۔

شاہ خالد کی آرزو تھی کہ وہ بیت المقدس میں نماز ادا کر سکیں۔ وفات سے پہلے لبنان پر اسرائیلی

حملہ ہوتے ہی موصوف نے بڑے سخت الفاظ میں امریکہ کو مراسلہ لکھا۔

شاہ خالد نے پوری کوشش کی کہ مغربی ثقافت و معاشرت کے لئے سعودی معاشرے میں دروازے نہ کھلنے پائیں اور شاہ فیصل کی اس پالیسی کو نبھانے میں وہ خاصے کامیاب رہے اور ملک میں دبے گھٹے ہوئے ماڈرنسٹ عناصر کو انہوں نے ابھرنے نہیں دیا۔

ہم شاہ فہد، خالد مرحوم کے خاندان اور پوری سعودی قوم کے سامنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ خدا خدماتِ شاہ خالد کو قبول کرے اور ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

تہنیت

اس موقع پر شہزادہ فہد سے ہم اظہار تہنیت بھی کرتے ہیں کہ انہیں سعودی مملکت میں شاہ فیصل اور شاہ خالد کی جانشینی کی سعادت ملی۔ ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے اس ذمہ داری کو اٹھاتے ہوئے قوم اور عالم اسلام کو یہ یقین دلائی کرائی ہے کہ وہ شاہ خالد کی پالیسیوں کو جاری رکھیں گے اور ان کے سوچے ہوئے منصوبوں کو پورا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ہمیں شاہ فہد کی صلاحیتوں سے پوری امید ہے کہ وہ اپنے اس اعلان کا حق ادا کریں گے۔ خصوصاً اتحادِ عالم اسلامی کے فروغ اور پاکستان سے برادرانہ تعلقات کے استحکام، نیز مظلوم فلسطینیوں اور افغانستانیوں کی حمایت و تائید — میں وہ مزید مؤثر پارٹ ادا کریں گے

(ادارہ)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

رمضان المبارک کے آٹھ دس روز گزر چکے ہوں گے کہ آپ تک ترجمان القرآن کا یہ شمارہ (جولائی) پہنچے گا۔

مبارک باد اُن پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جنھوں نے اب تک کے روزے رکھے اور جو پورا ماہِ رمضان روزہ داری کی حالت میں گزارنا چاہتے ہیں۔ اپنی بدنی خواہشات کو ایمانی و روحانی تقاضوں کے تابع رکھنے والے یہ لوگ ملتِ اسلامیہ کا اصل جوہر ہیں اور معاشرے میں اگر کوئی خیر و خوبی ہے تو ایسے ہی صبر کیش عنصر کے دم سے ہے۔

ہزار افسوس ان بدنصیبوں پر جن میں اتنی قوتِ ایمانی نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اپنے تابع رکھ سکیں، بلکہ اُلٹا چند ادنیٰ خواہشات اُن پر سواری کر رہی ہیں۔ فساد اور خیانت اور ظلم اور بدعنوانیوں کے فروغ میں زیادہ تر حصّہ ایسے ہی خواہش پرستوں کا ہے۔ انہی کے افکار و اعمال سے ملّت اسلامیہ کی قوتیں تباہ ہوتی ہیں اور مسلمان خوار و زار ہیں۔

ایک روزہ وہ ہے جو روزے کے احکام، اس کے مقاصد اور تقاضوں کو سمجھے بغیر رکھا جائے، یعنی ایک مشینی سی اطاعت، اور اطاعت اپنے اصل معنوں میں نہ ہو تو آبائی یا خاندانی یا سماجی معمول کی رَو میں آدمی بہتا رہتا ہے۔

ایک روزہ وہ ہے جو ایمان و احتساب کے ساتھ رکھا جائے اور یہی مطلوب شریعت ہے کہ

روزہ آدمی جذبۂ ایمانی کے ساتھ رکھے، یعنی میں ایک لاشریک خالق و مالک کا بندہ ہوں جو میرا رب اور اِلٰہ ہے، میں اس کی سلطنت میں رہتا ہوں اس کے رزق پر پلتا ہوں اور میرے لیے اُس کی طرف سے امتحانِ وفا یہ رکھا گیا ہے کہ آیا میں اُس کی خوشنودی کے لیے اپنی تند خواہشات پر قابو رکھتا ہوں یا نہیں۔

پھر اس روزے کے کچھ مقاصد ہیں جو روزہ فرض کرنے والے آقا نے خود ہی مقرر کیے ہیں، اِن مقاصد میں سرِفہرست تقویٰ ہے، پھر صبر ہے، پھر قرآن سے ربط و تعلق ہے، پھر خباثت و دروغ اور غیبت و چغل خوری سے اجتناب ہے، حرام اشیاء اور اعمال سے پرہیز ہے، پھر صدقہ ہے، جذبۂ جہاد ہے، دعوت الی اللہ ہے اور یوں سمجھیے کہ سارے کا سارا دین روزے کے گرد مترتب ہو جاتا ہے۔ جس نے ایمان و شعور اور خود احتسابی کے ساتھ روزہ رکھا اُس نے درحقیقت پورا دین سمیٹ لیا۔

ایمان جہاں روزہ کا اصل محرک ہے، وہاں وہ ذریعۂ احتساب بھی ہے۔ اِسی لیے اِن دونوں چیزوں کو جمع کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس کسی نے ایمان و احتساب کے ساتھ روزے رکھے اُس کے تمام گناہ معاف ہو گئے۔ یعنی ایمان و احتساب والا روزہ معصیت کی دلدل سے نکال کر انسان کو تقویٰ کے بہارستان میں لے آتا ہے۔ پس روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کا احتساب بھی کرتا رہے کہ اس کے روزے کے مقاصد صحیح طور پر پورے ہوں اور ایسی متضاد چیزیں روزے کے ساتھ جمع نہ ہوں جو روزے کے مقاصد کو نقصان پہنچاتی ہیں، یا عند اللہ اُسے بالکل ہی کالعدم کر دیتی ہیں۔

تو آئیے ذرا غور کریں کہ احتساب کیا کیا اور کدھر کدھر سے!

پہلا نکتۂ احتساب یہ ہے کہ صحیح جذبۂ ایمانی اس کا محرک ہو اور نیتِ خالص کارفرما ہو۔ نیت صرف وہ خالص ہوتی ہے جس کا واحد ہدف مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہو۔ کوئی شائبہ ریا یا خواہشِ داد و ستد شامل ہو جائے یا محض کسی شخص یا گروہ کے سامنے اہمیت اختیار کرنا مطلوب

بن جائے تو نیت خالص نہیں رہتی - نیت خالص کے بغیر کوئی بہترین عمل یا ایثار بے برگ و بار ہو جاتا ہے، مثلاً انفاق اور جہاد، یا قربانی اور شہادت جیسی سعادتیں بھی آدمی کو کچھ نہیں دے سکتیں -

پس ایک روزہ دار مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قلب کی کیفیت پر نگاہ رکھے اور مسلسل نگرانی کرے کہ دل کی مسند پر رضائے الٰہی کی جگہ کوئی دوسرا جذبہ تو قابض نہیں ہو گیا، کہیں اس کا جی یہ تو نہیں چاہتا کہ جا بجا یہ ظاہر کرتا پھرے کہ میں نے روزہ رکھا ہے یا میں بہت قرآن پڑھتا ہوں اور بڑی باقاعدگی سے تراویح ادا کرتا ہوں - ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر کسی اہم ضرورت سے ایسی کوئی بات مجملاً بتانی پڑ جائے، لیکن خطرناک معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اندر خواہشِ اعلان و اشتہار موجود ہو-

---

دوسرا بڑا نکتۂ احتساب یہ ہے کہ جھوٹی بات کہنا یا جھوٹے طرزِ عمل کو اختیار کرنا دین میں سخت ناپسندیدہ چیزیں ہیں — اس وجہ سے خاص توجہ دلا کر روزہ دار سے یہ مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ جس طرح دن میں کھانے پینے سے اجتناب کر رہا ہے اسی طرح اپنی مجموعی زندگی سے قول زُور اور عمل بالزُور کو خارج کر دے -

غلط بیانی کرنا، جھوٹی قسمیں کھانا، لوگوں سے فریب کرنا، خیانت کاری اور اس سلسلے کی تمام چیزیں عام حالات میں بھی ممنوع ہیں لیکن روزہ دار سے یہ چاہا گیا ہے کہ وہ اس پہلو سے اپنے اقوال و اعمال کا خاص دھیان رکھے اور ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو پاک کرے اور جو روزہ دار ایسا نہ کرے اس کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ ایسے شخص کا روزہ محض بھوک پیاس بھگتنا ہے اور خدا کو اُس کی بھوک اور پیاس کی کوئی ضرورت نہیں ہے -

ذرا حضورؐ کے ارشاد پر غور کیجیے، بڑی وعید ہے - اگر جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے ہی پرہیز نہ کیا جائے تو پھر روزہ دار کو آخرت میں کچھ نہ ملے گا -

دراصل حدیث کے یہ الفاظ " قولَ الزُورِ والعملَ بہٖ " ایسے جامع الفاظ ہیں کہ

نہ صرف غیبت اور دشنام کو محیط ہیں بلکہ ہر قسم کی خیانت اور بدعنوانی اور حرام خوری کو بھی حاوی ہیں۔

روزہ دار کو اپنی پوری زندگی، اپنے املاک، اپنے کاروبار اور اپنی سرگرمیوں پر نگاہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس کے ہاں "اکل اموال بالباطل" کی کوئی شکل تو موجود نہیں ہے؟ سُود یا قمار یا ملازمین اور محنت کاروں کے استحصال سے ناجائز فائدہ تو حاصل نہیں کیا جا رہا؟ کوئی حرام جائداد تو نہیں ہے؟ کوئی ناجائز ذریعۂ معاد تو کام نہیں کر رہا؟ کسی کی امانت تو اپنے ذمے نہیں ہے؟ کسی کا قرض تو واجب الادا نہیں ہے؟

ایک سچے روزہ دار کا کام یہ ہے کہ وہ اگر اپنے دائرۂ حیات میں خیانت یا بدعنوانی یا ظلم کا کوئی شائبہ بھی پاتا ہو تو اُسے ترک کر دے اور کسی کا حق مارا ہو تو حق دار کو اس کا حق واپس پہنچا دے۔ صرف اتنی روزی سے کام چلائے جس کے متعلق اُسے تسلی ہو کہ یہ قولی اور عملی زُور سے پاک ہے۔

نہ دیکھے کہ اس کے ساتھ بیٹھنے والے کیا کیا نا مارے بے تحاشا اُٹھا رہے ہیں، نہ پروا کرے کہ ادنیٰ ادنیٰ لوگ کیسی کیسی آسائشیں سمیٹ رہے ہیں، آنکھوں کو نہ جھکنے دے بڑی بڑی عمارتوں اور گاڑیوں اور مشینوں اور پلاٹوں اور بنک بیلنسوں کے سامنے۔

جائز و ناجائز کی حدود سے آزاد، دولت کا یہ پورا گندا کھیل آدمی اور اُس کے خدا کے درمیان ایک دیوار بن گیا ہے۔ آدمی کو اس دَور نے کمانے اور کھانے کی ایسی مشین بنا دیا جس کی پوری قوتیں اور جس کا سارا وقت روپے کے گرد طواف کرنے میں گذر جاتا ہے۔ اس حائل شدہ دیوار کو ڈھانا مومن کا کام ہے اور یہ کام روزہ داری کی حالت میں خصوصیت سے ہونا چاہیے۔

دولت پرستی کی دیوار کو ڈھانے کے لیے رمضان میں صدقہ کرنے کی خصوصی ترغیب دلائی گئی ہے۔ صدقہ اس شکل میں بھی کہ لوگوں کا روزہ افطار کرا دینے میں خرچ کیا جائے۔ دوستوں اور مستحقین کے کھانے کا انتظام کیا جائے؟ اہل احتیاج کے لیے کپڑوں، جوتوں یا دوا کا بندوبست کیا جائے، طالب علموں کے لیے فیسوں اور کتابوں کی فراہمی کی صورت میں مدد کی جائے، قیدیوں کو جیل میں کھانا، کپڑا یا دوسری ضروریات پہنچائی جا سکتی ہوں تو پہنچائی جائیں، ہسپتالوں میں اگر

نادار مریضوں کو دوا، غذا، پھلوں یا کسی دوسرے ضروری سامان کی شکل میں مدد دی جا سکے تو دی جائے۔ سرزمینِ پاکستان کے روزہ داروں کی خاص توجہ مہاجرین افغانستان کی بے وطنی و بے کسی پر بھی ہونی چاہیے۔ رمضان کے اختتام پر فطرانہ بھی دینا لازم ہے۔ بعض لوگ تو زکوٰۃ بھی پابندی سے رمضان ہی میں ادا کرتے ہیں۔

صدقہ کی یہ سادی صورتیں روزہ داری کی روح کو توانا کرتی ہیں اور انسان اور خدا کے درمیان دُنیوی مادیت کی حائل شدہ دیوار کو گرا کر بندہ و آقا میں قرب پیدا کرتی ہیں۔

تیسرا نکتۂ احتساب یہ ہے کہ روزہ دار کو خیال رکھنا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ لڑے جھگڑے نہیں۔ لڑنا جھگڑنا یوں بھی اچھا رویہ نہیں ہے، لیکن روزے کی حالت میں تو یہ عین روزے کی اسپرٹ کا نقیض ہے۔

چونکہ روزہ دار پر بھوک پیاس کی حالت میں ایک کرب طاری ہوتا ہے، اس کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور اس میں آسانی سے جذباتی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے، اس لیے حضورؐ نے بطور خاص متنبہ کر دیا کہ روزہ دار سے اگر کوئی دوسرا جھگڑنے لگے تب بھی اسے معذرت کر دینی چاہیے وہ صاف کہہ دے کہ بھائی میں اس میدان کا مردِ نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہو تو اپنی معذرت کو واضح کرنے کے لیے مجملاً یہ بتا بھی دے کہ میں روزے سے ہوں۔ یعنی میں نے ایک بھاری ذمہ داری اُٹھا رکھی ہے اور مجھ پر خدا اور رسولؐ کی طرف سے سخت قدغن لگی ہوئی ہے۔ میں ایک بگٹٹ اور آزاد رَو آدمی نہیں ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ مجھ پر اصل پابندی تو ایمان کی تھی ہی، اب مزید ایک پابندی روزہ کی وجہ سے ہے۔

یہ بھی صبر کا ایک بڑا مظہر ہے کہ آدمی دوسروں سے نہ صرف یہ کہ جھگڑا نہ کرے بلکہ دوسرے اگر بدکلامی اور تلخ مزاجی کا مظاہرہ کریں تب بھی بچ بچا جائے۔

(باقی بر صفحہ ۴۸)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

(۱)

اسلامی انقلاب اور ہمارا فرض

مولانا سے ایک مرتبہ ایک تربیت گاہ میں سوال کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی جماعت، جن کے ہاتھوں اسلامی انقلاب برپا ہوا ان کے تقویٰ، قناعت، کفایت شعاری جانی و مالی ایثار، توکل علی اللہ اور شوقِ شہادت کا معیار اتنا اونچا تھا کہ جس کا نمونہ موجودہ تحریکِ اسلام کے کارکنوں میں پایا جانا تو درکنار اس کا سواں حصہ بھی نایاب ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ مہم سر کی جاسکے جو صحابہؓ نے سر کی ہے۔ پھر ایسے بلند مرتبہ رہنماؤں اور کارکنوں کے ہاتھوں جو اسلامی انقلاب برپا ہوا وہ بھی معیاری صورت میں ۳۰ سال ہی چل سکا، صرف اس لیے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان پہلے صحابہؓ جیسے لوگ نہ تھے اب جس معیار کے رہنما اور کارکن تحریکِ اسلامی میں ہیں اُن کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہونا اوّل تو سخت مشکل ہے اور اگر وہ برپا ہو بھی جائے تو شاید تیس دن بھی نہ چل سکے گا۔

مولانا نے فرمایا: یہ سوال تو ایک پورا خطبہ ہے تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو اپنے نصب العین سے مایوس کر دینے کے لیے۔ اگر اس کا مقصد خود مایوس ہونا اور دوسروں میں مایوسی پیدا کرنا نہیں ہے تو اس معاملے پر اچھی طرح سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے اعلیٰ درجے کے مربّی تھے اور جتنا بلند ترین نمونہ حضورؐ نے اپنی زندگی کا لوگوں کے سامنے پیش کیا، اس طرح کا کوئی رہنما قیامت تک مسلمانوں کو میسر نہیں

آسکتا اس طرح حضورؐ کی تعلیم و تربیت کی بدولت جیسے اعلیٰ درجے کے کارکن دعوتِ اسلامی کی خدمات انجام دینے کے لیے اس وقت تیار ہوئے تھے اُس پائے کے کارکن بھی تیار کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ اب کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دینِ حق قائم کرنے کی کوشش ہی نہ کریں۔ اگر اس کام سے رُک جانے کے لیے یہی دلیل استعمال کی جائے تو اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں یا تو دینِ باطل دُنیا میں قائم ہو اور ہم اس کے تابع بن کر رہیں یا پھر خود بھی دینِ باطل کے قائم کرنے میں لگ جائیں تاکہ دُنیوی لذات اور فوائد و منافع سے تو اچھی طرح شادکام ہوسکیں اس کے لیے کسی قسم کی بھی اخلاقی بلندی درکار نہیں ہے۔ صرف پستی کی طرف گرنا ہی ہے جو کسی محنت اور کوشش کے بغیر بآسانی ہوسکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ وہ غلط طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں جو اس سوال کے اندر مضمر ہے، انھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ طرزِ فکر آخر کار ہمیں کہاں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ صحیح طور پر سوچتے تو سیدھی راہ اُن کے سامنے خود بخود واضح ہو جاتی۔ ایک مومن کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ جس بلندی پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اُس کی طرف چڑھنے کے لیے وہ جتنی کوشش کرسکتا ہے کرے اور عمر بھر کرتا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس بلندی پر چڑھتے ہوئے اگر کوئی شخص تھک کر راستے ہی میں گر جائے اور وہیں مر جائے تو وہ کامیاب ہے۔ لیکن ایک آدمی یہ دیکھ کر کہ چڑھائی بہت اُونچی ہے، کھڈ کی طرف جانا شروع کر دے تو جائے گا بڑی آسانی سے لیکن گرے گا بھی ایسی جگہ جہاں اس کا پرزہ پرزہ بکھر جائے گا۔ قرآن پاک کو آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ انسان کو سیرت و اخلاق کی بلندیوں پر چڑھنے سے مایوس نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی "اور جس نے راہِ خدا میں مال دیا اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اُس کو ہم آسان راستہ کی سہولت دیں گے" بلکہ اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا "اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے اُن کو اپنے راستوں کی ہدایت ہم خود دیں گے" لہٰذا آپ خدا کی راہ میں جان لڑائیں اور اس سے توفیق مانگتے رہیں ساتھ اپنی ایک ایک کمزوری کو سمجھیں اور اسے دُور کرنے کی کوشش کریں اپنے اندر جو بہتر صلاحیتیں پائیں اُن کو بھی اچھی طرح سمجھیں اور

ان کو ترقی دینے کی کوشش کریں، اس تزکیۂ نفس میں قرآن و حدیث اور سیرتِ پاک اور صحابہؓ و اخیارِ اُمت کی سیرتیں پڑھنے سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے اور اگر جماعت کے سب افراد اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ سب بھی ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنے آپ کو پستیوں سے اٹھانے اور بلندیوں کی طرف لے جانے کی جتنی کوشش بھی آپ اللہ کے بھروسے پر کریں گے اتنے ہی بلند مراتب پر اللہ تعالیٰ آپ کو پہنچا دے گا، کیونکہ یہ اُس کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود بھی انسان کی اصلاح و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام میں جو اخلاقی بلندی مطلوب ہے وہ باطل کے مقابلے میں لڑنے اور حق قائم کرنے کی کوشش میں جان لڑانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کی جس بلندیٔ مدارج کو دیکھ کر آپ پر حیرت اور مایوسی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے وہ کسی گوشۂ عزلت میں چلّے کاٹنے کا ثمرہ نہ تھی بلکہ اللہ کی راہ میں مار کھانے، اذیتیں سہنے، قیدیں برداشت کرنے، بھوکے مرنے، نقصان اٹھانے، خطرات کا سامنا کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے سے حاصل ہوتی تھی۔ آدمی کو اللہ اور اُس کے دین سے عشق نہ ہو تو وہ اس وادیٔ پرخطر میں اُتر ہی نہیں سکتا اور جب وہ اس میں اُترتا ہے تو ہر چوٹ کھا کر اُس کا عشق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی عشق ان بندگانِ حق کو اتنی بلندیوں پر اُٹھا لے گیا۔ آپ باطل سے لڑنے اور اس کی جگہ حق قائم کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائیں گے تو اللہ آپ کے ساتھ کسی بخل سے کام نہ لے گا۔

اب رہا یہ خیال کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کا برپا ہو جانا ہی سخت مشکل ہے اور اگر وہ ہو بھی جائے تو تیس سال کیا، تین دن بھی قائم نہ رہ سکے گا تو اس کے متعلق میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے اُوپر اسلامی نظام برپا کر دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ اس کے لیے جان لڑانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس کا برپا ہونا نہ ہونا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، اور یہ بھی اللہ کی مشیت ہی پر منحصر ہے کہ وہ قائم ہو تو کب تک چلے اور کب تک نہ چلے۔ لہٰذا ان باتوں کو سوچ سوچ کر متفرقِ دلی میں مبتلا ہو جانا درست نہیں ہے۔ آپ کے کرنے کا جو کام ہے اُسے اپنی حد تک زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کریں

اور اللہ کے کرنے کا جو کام ہے اُسے اللہ پر چھوڑ دیں۔

(رپورٹ "ایشیا" ۱۰ مئی ۱۹۸۱ء بہ عنوان "بیادِ مجلس مودودیؒ")

(۲)

تو پھر اس جماعت کے بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

ایک مقامی جماعت کے امیر رپورٹ کرتے ہیں کہ،

درخواست کنندہ نہایت صالح نوجوان ہے اور جماعت کے کاموں میں کافی ایثار اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ اس کے بارے میں صرف انہی جعلی حسابات[1] کا معاملہ ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے .... وہ نہایت مجبوری کی حالت میں غلط حسابات پیش کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو جان بوجھ کر غلط بات کو صحیح بنا کر پیش کرتا ہے، رکنیت کے لیے کیسے قبول کرلیں۔

آپ ہمیں اس کے متعلق مشورہ دیں۔ (تلخیص سوال)

جواب:۔ ہم نے یہ جماعت اس لیے نہیں بنائی ہے کہ ایک ایک آدمی ایک ایک مجبوری کی بنا پر دین و اخلاق کے ایک ایک اصول کو توڑتا چلا جائے۔ اگر ایسا ... ہی کرنا ہوتا تو پھر اس جماعت کے بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہمارے پیش نظر تو ایسے لوگوں کو منظم کرنا ہے جو بہرحال صداقت اور دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور جھوٹ اور بددیانتی کی طاقتوں سے دبنے کے بجائے اُن سے لڑیں۔ اگر ہم اس طرح جماعت کے نظم میں ڈھیل دیتے چلے جائیں کہ جن جن بددیانتیوں کے لیے لوگ مجبور ہوں اُن کی اجازت دے دیا کریں تو اس جماعت میں بھی ضعیف الاخلاق لوگ جمع ہو جائیں گے اور اُن سے کوئی اصلاح کا کام نہ ہو سکے گا۔ (اقتباس از جواب)

(رسائل و مسائل حصہ ۲ - ص ۵۷۰ تا ۵۷۲)

---

[1] یعنی جن کا تفصیلی تذکرہ اس تحریر میں پہلے ہو چکا ہے۔ (مرتب)

عقل کی محدودیت اور وحیِ الٰہی

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ حضرت انسان کے لیے ساری زمین اور سارے آسمانوں کو دائرۂ عمل اور میدانِ کار مقرر فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ـــــ جب کہ اس سے پہلے اُس کا عرش پانی پر تھا ـــــ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے، تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ (ہود ـــ ۷) یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ انسان کی آزمائش کے لیے میدانِ عمل یہ زمین اور آسمان اور ساری مادی کائنات ہے۔ قرآن مجید نے اس کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عالمِ غیب اور عالمِ شہادۃ (انعام ـــ ۷۳)۔ پھر عالم شہادہ کی مزید دو قسمیں کی گئی ہیں۔ عالمِ انفس اور عالمِ آفاق (فصّلت ـــ ۵۳)۔ اِس طرح یہ کائنات تین عوالم پر مشتمل ہے ـــــ عالمِ غیب، عالمِ انفس اور عالمِ آفاق۔ دُنیا میں آکر انسان کو ان تین عوالم سے ہی سابقہ پیش آتا ہے۔

عالمِ آفاق یہ آسمان، یہ ستارے، یہ جمادات، نباتات اور حیوانات، یہ سارا عالمِ فطرت اور عالمِ طبیعیات، عالمِ آفاق ہے ـــ یہ انسان کو ہر چہار اطراف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ مادی دُنیا ہے۔ مادی جسم کے حاصل ہونے کی حیثیت سے انسان کو سب سے زیادہ واسطہ عالمِ مادیات سے پیش آتا ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے بھی اس کو اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے سب سے زیادہ سابقہ عالمِ مادّیات سے پیش آتا ہے۔ اس لیے یہ بات نہایت ضروری تھی کہ مادّی دُنیا سے معاملہ کرنے کے لیے انسان کے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ اِس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ حسّی اور عقلِ استدلالی

سے نوازا ہے۔ عقلِ حسی اور عقلِ استدلالی کی مدد سے انسان مادی اشیاء کے خصائص معلوم کرتا ہے۔ ان کی تاثیرات معلوم کرتا ہے اور پھر ان کو حسبِ منشا اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ اگر عقلِ حسی کی نعمت انسان کو حاصل نہ ہوتی تو پھر مادی دنیا سے معاملہ کرنا دشوار ہو جاتا۔ اگر کبھی استدلال کرتے وقت انفرادی عقل سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اجتماعی عقل اس کی اصلاح کر لیتی ہے، اس طرح مادی دنیا میں غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ عقل انسانی کا دائرہ کار ہے۔ اِس دائرہ کار میں عقل خود کفیل ہے، خود مکتفی ہے، کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔

انسان کے عہدِ طفولیت میں عقلِ انسانی بھی بلوغت کو نہیں پہنچی تھی، پختہ نہیں ہوئی تھی، اس لیے انبیائے کرام علیہم السلام نے عالمِ مادیات سے متعلق بعض اُمور کی تعلیم دی ہے حالانکہ ان کا دائرہ کار عالمِ مادیات نہیں ہے۔ وہ تو عالمِ انفس میں اور عالمِ غیب میں نوعِ انسانی کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنانے کا فن سکھایا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے تعلیم و تدریس کا فن سکھایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے لوہا پگھلانے کا فن سکھایا۔ لیکن جب نوعِ انسانی بلوغت کو پہنچ گئی تو یہ مادی میدان بالکلیہ عقل کے سپرد کر دیا گیا۔ وحیِ الٰہی اس میں مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مادی علوم کے دروازے اللہ تعالیٰ ایک خاص تدریج کے ساتھ انسانوں پر کھولتا جاتا ہے۔ اس کا ایک ضابطہ اور ایک طریقہ کار ہے۔ اس ضابطہ کی چند شقیں یہ ہیں :-

۱ــ سب سے اوّل اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری مادی کائنات کو اپنے خلیفہ انسان کی عقلِ استدلالی کی زد میں دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، سب کچھ اپنے پاس سے (حاشیہ ۱۲) اُس نے زمین اور آسمانوں کی محافظ قوتوں ـــ فرشتوں ـــ کو انسان کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــ "فرشتے سب کے سب (انسان کے آگے) سجدہ میں گر گئے"۔ (ص ـ ۷۳) سجدہ میں گر جانا اطاعت اور فرماں برداری کی علامت ہے۔ اس حکم سے ظاہر ہے کہ ساری مادی کائنات کو بالقوہ انسان کی زد میں دے دیا ہے۔ اب صرف بالقوہ سے بالفعل میں

لاتے کا مرحلہ ہے۔ انسان بتدریج طبعی قوتوں کو مسخر کر رہا ہے اور اپنے تصرف میں لا رہا ہے۔

۲ — اللہ تعالیٰ علم کی صرف اتنی مقدار انسان کی عقل وفہم پر کھولتا ہے جتنی کہ وہ ہضم کرسکے۔ جس قدر وہ اپنے تصرف میں لاسکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں، ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔ (حجر — ۲۱) اس سے واضح ہوتا ہے کہ نوع انسانی کے علم میں اضافہ رفتہ رفتہ بتدریج ہوتا ہے۔

۳ — اللہ تعالیٰ حسب مناسب خیال فرماتا ہے خود ہی علم کی ایک مقدار انسانوں پر منکشف فرما دیتا ہے۔ بیشتر علوم القائے ربانی سے منکشف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس کی (اللہ کی) معلومات میں سے کوئی چیز ان کی (انسانوں کی) گرفت میں نہیں آسکتی، مگر یہ کہ وہ خود ہی کسی چیز کا علم دینا چاہے (بقرہ — ۲۵۵)۔ اللہ تعالیٰ حسب مناسب سمجھتا ہے کسی بندے کے قلب پر اس علم کا القا فرما دیتا ہے اور پھر وہ شخص اس علم کو عام کر دیتا ہے۔ علوم کی اختراع اور سائنس کی ایجادات اور انکشافات کی تاریخ پڑھتے وقت یہ بات بہ تکرار سامنے آتی ہے کہ کسی معمولی سے واقعہ یا حادثہ سے کسی انسان کا ذہن اس علم یا ایجاد کی طرف منتقل ہو گیا — حالانکہ اس سے قبل بھی وہ اس واقعہ یا حادثہ کو دیکھتا رہا ہے۔ بس یہی القائے ربانی کی صورت ہے۔

۴ — علوم کا یہ القا صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جو علوم کی قدر کرتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اگر تم شکر گزار ہوگے (قدر افزائی کروگے) تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا۔" (ابراہیم — ۷) یعنی علوم وفنون کے انعامات اور عطیات صرف ان افراد کو اور ان اقوام کو ملتے ہیں جو ان علوم کی قرار واقعی قدر کرتے ہیں جو ان علوم میں انہماک اور استغراق رکھتے ہیں جو اپنا اہل ہونا ثابت کر دیتا ہے اسی پر اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہوتا ہے۔

اس ضابطہ کے مطابق نوع انسانی مسلسل مادی علوم اور ایجادات میں اضافہ کرتی جارہی ہے۔

عالم النفس انسان کے گرد دوسرا دائرہ خود انسان کا ہے۔ یہ عالم انسانیت کا میدان ہے۔

یہ علومِ عمرانی اور علومِ انسانی کا میدان ہے۔ یعنی یہ عالمِ النفس ہے۔ بلا شک و شبہ اس میدان میں بھی عقلِ استدلالی کی فتوحات کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہیں۔ انسانی وجود اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بہت سے علوم و فنون انسان نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ ان سب پہلوؤں سے متعلق بیش بہا معلومات کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ یہ سب قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہے۔ لیکن یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہر معقول آدمی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ علومِ مادی اور علومِ عمرانی میں واضح فرق موجود ہے۔ علومِ مادی میں نتائج بڑی حد تک قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ لیکن علومِ عمرانی میں عقلِ استدلالی کی قیاس آرائیاں قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذی حیات، خود مختار اور صاحبِ ارادہ انسان اپنی ماہیت میں بے جان اور جامد مادے سے قطعاً مختلف ہے۔ نہ وہ انسان جس کا مطالعہ کیا جا رہا ہے جامد ہے کہ ہر حال اور ہر وقت یکساں قائم رہے۔ نہ مطالعہ کنندہ غیر جانبدار رہ سکتا ہے کہ نتائج یکساں برآمد ہوں۔ پھر مادی دنیا میں ایک عقل کی غلطی دوسری عقل پکڑ لیتی ہے۔ عالمِ انسانیت میں عقل کے پاس کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ غلطی پکڑ لی جائے۔ اس لیے صدیوں تک غلطی کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل کی تلون مزاجی اور اس کی محدودیت حقیقتِ نفسِ انسانی تک رسائی حاصل کرنے میں عموماً ناکام رہتی ہے۔ عالمِ انسانیت میں عقلِ استدلالی قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں ہے جس طرح کہ وہ عالمِ مادیت میں ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ عالمِ انسانیت میں پھر کیا کیا جائے؟ غلطیوں سے بچنے کی کوئی سبیل ہے؟ عالمِ انسانیت میں راہِ صواب کیا ہے؟ یا پھر انسان غلطیوں کی بھول بھلیوں میں سرگرداں و حیران مارا مارا پھرتا رہے؟ البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ حضرتِ انسان کو حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ گمراہی میں بھٹکنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ اُس نے انسان کو راہ ہدایت بتانے کا انتظام فرمایا ہے۔

ازل میں دُنیا میں آنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ حسی (عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ) کا انعام دیا۔ جنت میں چند روز مہمان رکھ کر انسان پر یہ حقیقت واضح کر دی، بلکہ اس کا تجربہ کرا دیا کہ تنہا عقلِ حسی غلطی میں مبتلا ہونے سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے نہیں بچا سکتی

ہے۔ اس کے لیے ایک برتر علم ـ علمِ ہدایت ـ کی ضرورت ہے۔ دُنیا میں بھیجتے وقت انسان کو نصیحت کی کہ "پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے اور ہماری آیات کو جھٹلا دیں گے، وہ لوگ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (بقرہ ـ ۳۸، ۳۹)۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف عقل ہی سے نہیں نوازا ہے، بلکہ اس نے انسان کو ہدایت سے بھی نوازا ہے۔ اس نے انبیاء کرام کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ وہ انسانوں کو اللہ کی ہدایت پہنچائیں۔ ہر ملک اور قوم میں اللہ کے رسولوں نے ہدایتِ الٰہی پہنچائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ (فاطر ـ ۲۴)۔ مذکورہ بالا آیت سے صراحت ہوتی ہے کہ عالمِ انسانیت میں رہنمائی کے لیے عقلِ استدلالی ناکافی ہے۔ یہاں ایک برتر علم یعنی علمِ ہدایت کی ضرورت ہے۔ عالمِ انسانیت کے لیے بنیادی معلومات علمِ وحی اور ہدایت الٰہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان بنیادی معلومات کی روشنی میں پھر عقل کو اپنی سرگرمی دکھانی چاہیے۔ عقلِ استدلالی کو وحی الٰہی کی رہنمائی اور ماتحتی میں کام کرنا چاہیے۔ عالمِ انسانیت میں عقل خودمختار اور خود مکتفی نہیں ہے۔ جیساکہ وہ عالمِ مادیت میں ہے۔ یہاں کے معاملات میں بالادستی ہدایتِ الٰہی کو حاصل ہے۔

جدید یورپ کے معمار ڈیکارٹ نے وحی الٰہی کا انکار کر دیا۔ اُس نے عقل کو کافی قرار دیا۔ اُس نے عقل کو خودمختار اور شترِ بے مہار بنا دیا۔ یورپ میں جدید افکار کی گاڑی جس دن سے پٹری سے اُتر گئی۔ اُس دن سے یورپ کی گمراہی کا آغاز ہوا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:-

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
رہنما ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

تاریخ افکارِ عالم پہ نظر رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ حق و باطل، خیر و شر، جائز و ناجائز، حقوق و فرائض، عدل و انصاف کے متعین کرنے میں عقلِ انسانی نے خوب خوب ٹھوکریں کھائیں۔

انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرنے میں عقلِ انسانی ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ اقتدار پر متمکن عقل بے لاگ عدل نافذ کرنے میں یکسر ناکام ہو گئی ہے۔ یہ مرحلہ درحقیقت عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر یہ دشوار مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ " بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔ اور لوہا بھی اُتارا جس میں بڑی طاقت بھی ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فوائد بھی ہیں" (حدید — ۲۵) - اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو محض وعظ و نصیحت کرنے کے لیے نہیں بھیجا - بلکہ اُن کی بعثت کا اصل مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے مابین تعلقات اور روابط کو عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم کر دیں۔ دنیا میں ایک عادلانہ اور فلاحی معاشرہ قائم کر دیں، جس میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہو اور بُرائیوں کو طاقت سے کچل دیا جائے، جس میں اطاعتِ رب اور اخلاقی اقدار کو اوّلین اہمیت حاصل ہو۔ رسول دُنیا میں ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ یہ کام انہوں نے وحی الٰہی اور ہدایت الٰہی کی رہنمائی میں انجام دیا۔ اب عقلِ انسانی کا کام یہ ہے کہ وہ ہدایت الٰہی کے تحت اپنی سرگرمی دکھائے۔ ہدایتِ الٰہی کے حدود سے باہر قدم نہ رکھے۔ جب بھی عقل نے ہدایتِ الٰہی سے بے نیازی اختیار کی ہے انسانی معاشرہ میں فساد رونما ہوا ہے۔ انسانوں کے تعلقات میں اور اخلاق میں ابتری پیدا ہوتی ہے۔ فساد کی جڑ عقل کی سرکشی اور خود مختاری ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

عالمِ غیب | تیسرا دائرہ انسان کے گرد عالمِ غیب کا ہے، جس کو فلسفی لوگ عالمِ مابعد الطبیعیات کہتے ہیں۔ دُور بین نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ عالمِ مادّیات جس پر انسان متصرف ہے۔ یہ عالمِ انسانیت جس سے انسان ہر آن متصادم ہے، اُن کی حقیقت پر غیب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کی حقیقت اور کنہ کے ادراک سے انسانی عقل عاجز اور درماندہ ہے۔ حالانکہ اس تصرف اور اس تصادم کے متعلق کوئی مثبت یا منفی رائے اُس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب

تک پیشگی یہ بات معلوم نہ ہو جائے کہ ان اشیا کی حقیقت کیا ہے؟ ان کا مقصد وجود کیا ہے؟ حقیقت لغیرہٖ تو کسی قدر معلوم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت لعینہٖ بالکل معلوم نہیں ہوتی پھر کیسے یہ بات معلوم ہو کہ انسان اُن کو کیسے اپنے تصرف میں لائے؟ خود انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تخلیق کس غرض کے لیے کی گئی ہے؟ کیا وہ ذمہ دار اور جواب دہ مخلوق ہے؟ یا پھر محض کھیل تماشا ہے؟ آخرت میں انسان کا حساب ہوگا؟ اوّل روز سے عالم انسانیت کے ذہین اور دانا افراد کے سامنے یہ سوال اُبھرتے رہے ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ عقل ان سوالات کے جوابات دینے کی پوزیشن ہی نہیں ہے۔ جو جوابات لوگوں نے دیے ہیں وہ سب بچگانہ ہیں اور قیاسی ہوائی قلعے ہیں۔ حالانکہ ان سوالات کے معقول جوابات حاصل ہونے ضروری ہیں۔

عالمِ مغیبات خالص وحی الٰہی کا میدان ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہے۔ یہاں پرواز کرنے سے عقل کے پر جلتے ہیں۔ انبیاء کی آمد اور کتابوں کا نزول صرف اسی مقصد کے لیے ہوا ہے کہ عالمِ مغیبات کی ضروری معلومات انسان کو مہیا کر دی جائیں۔ جن کی روشنی میں وہ اپنی کارگزاری کا صحیح منصوبہ بنا سکے۔ انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ وہ کوئی غیر ذمہ دار کھلنڈرا نہیں ہے وہ ایک ذمہ دار اور جواب دہ مخلوق ہے، جس کو حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی مقصدی زندگی ہے۔ وہ کوئی من موجی، سیلانی اور خود پرست نہیں ہے۔ اس کی کارگزاری کا ایک دن حساب لیا جائے گا۔ کامیاب قرار دیے جانے پر جنت ملے گی۔ ناکام قرار دیے جانے پر دوزخ ملے گی۔

غیب کے اس علم کو دل و جان سے قبول کر لینے کے بعد ایک ذمہ دار، با اخلاق شریف انسان وجود میں آتا ہے۔ اور اس علم کا انکار کر دینے پر غیر ذمہ دار، نفس پرست، خونخوار وحشی انسان وجود میں آتا ہے۔ دونوں یکساں نہیں ہیں، دونوں میں بُعدِ بعید ہے، اس لیے غیب کا علم جاننا انسان کی ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ ضرورت روٹی اور پانی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ یہی علم ہے جو انسان کو حیوانیت کے درجے سے اٹھا کر انسانیت کے مقامِ رفیع پر پہنچاتا ہے۔ ورنہ خود غرض انسان کو درندہ بننے سے کوئی شے نہیں روک سکتی۔ یہ علم وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے وحی الٰہی کو اور ہدایت الٰہی کو ماننا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہدایت الٰہی کی رہنمائی

میں عقل انسانی اپنی کارگزاری دکھا سکتی ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہاں اس بات کا اظہار بے محل نہیں ہو گا کہ یہ سہ گانہ تقسیم اگر پیش نظر رہے تو قرآن مجید کی ہدایات کا دائرہ کار سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض لوگوں کو قرآن مجید کا مدعا اور مطلوب سمجھنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ بھی رفع ہو جاتی ہیں۔ قرآن مجید مادی دائرہ سے بالکل تعرض نہیں کرتا۔ یہاں انسانی عقل رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہے۔ یہاں غلطیوں کی اصلاح عقل خود ہی کر لیتی ہے۔ قرآن مجید کی تمام ہدایات پہلے درجے میں عالم انسانیت سے متعلق ہیں، جہاں عقل کی رہنمائی ناکافی ہے۔ اس لیے گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہاں بہتر رہنمائی وحی الٰہی مہیا کرتی ہے۔ ہدایت اس سے وابستہ ہے اور پھر دوسرے درجے میں عالم مغیبات سے متعلق ہے۔ جہاں عقل کی رسائی بالکل نہیں ہے۔ جہاں تمام تر رہنمائی صرف وحی الٰہی مہیا کرتی ہے۔ یہ بات ضمناً عرض کر دی گئی ہے۔

یہاں ایک نظر اس حقیقت پر ڈالنا چاہیے کہ وحی الٰہی کا انکار کر دینے کے بعد اور آسمانی مذہب ترک کر دینے کے بعد مغربی انسان نے کیا پایا اور کیا کھویا۔

وحی الٰہی کو تسلیم کرنے اور مذہب پر ایمان لانے کے دو فائدے تو بالکل ظاہر ہیں۔ مذہب لوگوں کو حق کے ماننے کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب حق کا معروضی معیار پیش کرتا ہے۔ یہ حق خواہشات اور مفادات سے بلند تر اور بالاتر ہوتا ہے۔ یہ حق غیر جانب دار ہوتا ہے۔ یہ حق بے لاگ انصاف مہیا کرتا ہے۔ اس کے مطابق فریقین کے تنازعات کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس حق کے مطابق کمزور طاقت ور کے خلاف دادرسی کر سکتا ہے۔ بلکہ اس حق کے معیار پر انسان اپنی اور دوسروں کی غلطیاں خود بھی معلوم کر سکتا ہے۔ چونکہ اس حق کا تعلق مذہب سے ہوتا ہے اس لیے اس کے فیصلوں کو لوگ بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان فیصلوں کے خلاف ان کے دلوں میں غم و غصہ کے جذبات نہیں بھڑکتے۔ افراد، طبقات اور اقوام کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ حق عالمگیر ہوتا ہے اور آفاقی ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ میں افراد، طبقات اور اقوام سب کو یکساں درجہ حاصل ہے۔ رنگ و نسل کے فرق کی یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں افراد

کو افراد پر، طبقات کو طبقات پر، اقوام کو اقوام پر بالادستی اور برتری حاصل ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تمام انسان قانون کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ عالمگیر حق پر تمام انسانوں کو مجتمع کیا جا سکتا ہے۔ اقوام و ملل میں وحدت پیدا کرنے کا یہ سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

مذہب کو زندگی کے معاملات سے بے دخل کرنے کے بعد مغربی انسان ان دونوں فوائد سے محروم ہوگیا۔ بے لاگ عدل و انصاف حاصل کرنے سے محروم ہوگیا اور وحدت اقوام و ملل سے محروم ہوگیا۔

مذہب کو معزول کر دینے کے بعد اہل مغرب نے عقل کو حَکَم کے منصب پر فائز کیا۔ انفرادی اور اجتماعی تمام تنازعات عقل کی بارگاہ میں پیش کیے جانے لگے۔ مگر وائے افسوس عقل اس منصب رفیع کی اہل ثابت نہیں ہوئی۔ عقل بے لاگ فیصلے کرنے سے قاصر ہے۔ تحلیل نفس کے مطابق عقل خود غرضی کی ایک لطیف ترین شکل ہے۔ عقل پرستی کے نام پر انسان در حقیقت اغراض پرستی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ افراد کے پیش نظر اُن کی خواہشات ہیں۔ اقوام کے پیش نظر اُن کے مفادات ہیں۔ خواہشات اور مفادات سے بلند تر کوئی مطمحِ نظر اُن کے سامنے نہیں ہے۔ کوئی عالمگیر معیارِ حق اُن کے پیش نظر نہیں ہے۔ اقوامِ متحدہ بڑی نیک تمناؤں اور نیک آرزوؤں کے ساتھ وجود میں آئی تھی۔ مگر وہاں بھی اغراض پرستی اور مفادات پروری کی کشمکش جاری ہے۔ اغراض پرستی اور مفاد پروری میں تصادم ناگزیر ہے۔ اس تصادم میں کمزور پس جاتا ہے اور طاقتور اپنی بات منوا لیتا ہے۔ پھر دلوں میں غبار جمع ہوتا رہتا ہے جو لاوے کی طرح پھٹنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اور ایک نئی عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

عقل پرستی انسانیت کو بلند تر معیارِ حق، اور بے لاگ عدل و انصاف مہیا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ عقل پرستی کے دور میں یہ ہو رہا ہے کہ حق کی جگہ مفادات نے اور انصاف کی جگہ طاقت نے لے لی ہے۔ مذہب کو ترک کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تنازعات سلطانِ حق کے سامنے پیش نہیں کیے جاتے ہیں بلکہ سلطانِ تلوار (طاقت) کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ ترقی معکوس نہیں ہے؟

نظریۂ تقادم اور اسلامی شریعت

ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

(۲)

گواہی میں کینہ و عداوت کا پہلو

اگر اس نے جرم کے وقوع کو دیکھنے کے بعد ایک عرصے تک گواہی نہیں دی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ستر کے پہلو کو ترجیح دی ہے۔ لیکن جب ایک مدت گذرنے کے بعد پھر گواہی دیتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اسے اپنے مشہود علیہ کے خلاف کوئی ضَغِینہ (عداوت، دشمنی) پیدا ہوا ہے، جس نے اسے عرصہ گذرنے کے بعد اس کے خلاف گواہی دینے پر اکسایا ہے، لہٰذا اس کی یہ شہادت قبول نہ ہوگی اس لیے کہ فرمانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ "لَا تقبل شهادة خَصْمٍ وَلَا ظَنِينٍ" (خصم اور متہم کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے)۔

نیز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

أَيُّمَا شُهُودٌ شَهِدُوا عَلَى حَدٍّ لَمْ يَشْهَدُوا عِنْدَ حَضْرَتِهِ فَإِنَّمَا شَهِدُوا عَلَى ضِغْنٍ فَلَا شَهَادَةَ لَهُمْ۔

ترجمہ:۔ جو لوگ کسی ایسی حد کی شہادت دیں، جس کی شہادت انہوں نے اس کے وقوع کے وقت نہیں دی تو ان کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔[1]

---

[1] ابو زہرہ الجریمہ، ص ۴۶۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمان پر صحابہ میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اجماع کے درجے میں ہو گیا اور اس سے معلوم ہو گیا کہ کس جرم کے سلسلے میں تاخیر سے آنے والی شہادت ضَغِینَۃ پر مبنی متصور ہو گی اور قبول نہیں کی جائے گی۔ کیوں کہ تاخیر تہمت پیدا کرتی ہے اور متہم کی شہادت حسب فرمانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم قابلِ قبول نہیں ہے۔

بخلاف حدِ قذف کے کہ اس میں تاخیر ضَغِینَۃ اور تہمت پر دلالت نہیں کرتی، اس لیے قذف کے مقدمے کی سماعت کے لیے مدعی (مقذوف) کا دعویٰ شرط ہے اس لیے اس میں تاخیرِ شہادت تاخیرِ دعویٰ پر مبنی ہو گی۔ جب کہ حدود ثلاثہ میں دعویٰ شرط نہیں ہے، اس لیے تاخیرِ شہادت، تقادم ہے اور ضَغِینَۃ اور تہمت کی حامل ہے۔

جہاں تک حدودِ ثلاثہ کے مانع قبول شہادت ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں ہے کہ یہ تاخیرِ شہادت بغیر کسی ظاہری عذر کے ہو، اگر کوئی ظاہری عذر موجود ہو، مثلاً شاید ایسے دُور دراز مقام پر ہو کہ اُس کے عدالت میں حاضر ہونے میں تاخیر ہو سکتی ہو تو بصورتِ عذر یہ تاخیرِ شہادت کے قبول سے مانع نہیں ہو گی۔[1]

شیخ محمد ابو زہرہ نے نظریۂ تقادم کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"عدالت میں کسی جرمِ حد پر شہادت کا تاخیر سے پیش ہونا حد کو ساقط کرنے والا شبہ بنتا ہے جب کہ تاخیر اقرار شبہ نہیں ہے۔"

اِس رائے کی دلیل دو اجزاء پر مشتمل ہے ایک جزء یہ کہ عدالت کے سامنے شہادت جرم پیش ہونے میں تاخیر ہو جانا حد جرم کے سقوط کا حامل شبہ پیدا کرتا ہے اور دوسرا جزء یہ ہے کہ اس مسئلے میں شہادت اور اقرار میں فرق ہے۔

پہلے جزء کی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کو ادائے شہادت کا حکم

[1] الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع جلد ۷، ص ۴۶، مصر۔

دیا ہے اور فرمایا ہے:۔

"واقیموا الشھادۃ للہ"

یہ گواہ اللہ کے لیے شہادت پر قائم رہیں (الطلاق۔ ۲)

نیز فرمایا:

"واستشھدوا شھیدین من رجالکم"

اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ کر لو (البقرہ۔ ۲۸۲)

اور فرمایا:۔

"فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم"

ان عورتوں پر اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ (النساء۔ ۱۵)

مزید یہ کہ کتمان شہادت سے منع فرمایا۔

"ومن یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ"

جو اس شہادت کو چھپائے گا، اس کا دل گنہ گار ہے (البقرہ۔ ۲۸۳)

ادائے شہادت کے ان احکام کے ساتھ ساتھ ستر مسلم بھی شریعت کو مطلوب ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ نے اشاعتِ فاحشہ سے منع فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

من ستر مسلمًا ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا والاٰخرۃ

"جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔" [1]

ان دونوں نوعیتوں کے احکام کی روشنی میں شاہد کے سامنے دو پہلو آگئے، ایک پہلو یہ کہ وہ جرم سے پیدا ہونے والے فساد کو ختم کرنے کے لیے معاشرے کی پامال شدہ اخلاقی حالت کو بحال کرنے کے لیے اور اللہ کی حدود کے نفاذ میں مدد دینے کے لیے شہادت دے، اور دوسرا پہلو یہ کہ وہ ستر مسلم کو ترجیح دے۔ یعنی شاہد معاملہ شہادت میں حق اللہ اور حق معاشرہ کا امین ہے اور

---

[1] ابوزہرہ الجریمہ، ص ۴۶۔

اس پر لازم ہے کہ اس حق کو پوری امانت کے ساتھ ادا کرے۔ اس طرح کہ اگر وہ امانتاً یہ سمجھے کہ عدالت کے روبرو گواہی دینا معاشرے کو اخلاقی فساد سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ تو یہ قدم اُٹھائے ورنہ اگر وہ یہ سمجھے کہ جو کچھ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک مسلمان کی لغزش ہے اور ایک مجرمانہ ذہنیت کا سوچا سمجھا اقدام نہیں ہے تو مسلمان کی لغزش پر پردہ ڈال دے۔

شاہد کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اُن میں سے ایک پہلو کو فوری طور پر اختیار کرے، کیونکہ شہادت میں بغیر عذر اور بلا کسی وجہ کے تاخیر کینہ، دشمنی اور عداوت کے کسی نئے پیدا ہو جانے والے جذبہ پر مبنی متصور ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ چونکہ وقتِ وقوعِ جرم شاہد کو مشہود علیہ کے خلاف کوئی دشمنی یا عداوت یا کسی قسم کی کوئی کد موجود نہیں تھی۔ اس لیے اس نے گواہی نہیں دی اور خاموش رہا، اور جب بعد میں کسی وجہ سے کوئی عداوت دشمنی یا کد (ضَغِینہ) پیدا ہو گئی تو شاہد نے مشہود علیہ کے خلاف گواہی دے دی اور اس طرح اس کی شہادت حامل تہمت ہوگی اور فرمانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق شہادت الظنین (متہم کی شہادت) قابلِ قبول نہیں ہے۔ یعنی اس شاہد کی شہادت میں یہ تہمت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اتنا عرصہ ادائے شہادت سے گریزاں رہا اور اس وقت تک کیوں سکوت اختیار کیے رکھا، یعنی نکتہ یہی ہے جس کی حضرت عمرؓ نے وضاحت فرمائی ہے اور جس کو امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے نقل کیا ہے۔

"اگر گواہوں نے کسی ایسے جرم حد کی گواہی دی، جس کی گواہی انہوں نے وقت وقوع جرم نہیں دی تھی تو یہ شہادت ضغینہ ہے اور قابلِ قبول نہیں ہے"۔ [1]

بہر حال اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ شہادت سے سکوت اختیار کرنے میں یا تو تہمت ضغینہ ہے یا تہمت فسق ہے، اور شہادت سے سکوت ان ہر دو تہمتوں کا حامل ہے، جہاں تک شہادت کی غیر ضروری تاخیر میں ضغینہ ہونے کا گمان (مظنتہ ضغینہ) ہے تو وہ حسب بیان سابق ظاہر ہے اور جہاں فسق کا احتمال ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کتمانِ شہادت سے شاہد فاسق ہو جاتا ہے، اس لیے کہ فرمانِ الٰہی ہے:-

---

[1] ابو زہرہ، الجریمہ، ص ۹۶

"ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه"

شہادت کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص شہادت کو چھپائے گا، تو اُس کا قلب گنہگار ہوگا۔ (البقرہ)

مندرجہ بالا بیان سے یہ امر واضح ہوگیا کہ سرقہ، زنا، اور شراب خمر کی حدود کی شہادت میں تاخیر سے یہ حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔ جب کہ اقرار میں تاخیر سے، خواہ یہ تاخیر کتنی ہی طویل مدت کی ہو، حدود کا اثبات ہو جائے گا، اور تاخیر سے جرائم حدود کے اثبات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ اقرار میں گمانِ عداوت (مظنۃ ضغینہ) نہیں ہے کہ انسان خود اپنا دشمن نہیں ہوتا اور بالخصوص اس صورت میں جب کہ اقرار ایک سخت سزا کی صورت میں ظاہر ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقرار کرنے والا اپنے ضمیر کی خلش کو ایک عرصہ تک دباتا رہا۔ لیکن ایک وقت آیا کہ اُس کے ضمیر نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اعتراف جرم کر کے دُنیا کی سزا بھگت لے اور سزائے آخرت سے بچ جائے۔

ولعذاب الآخرة اشد وابقٰى

(طٰہٰ - ۱۲۷)

حضرت امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جرم شرب خمر (مے نوشی) کے ثبوت میں تاخیر اقرار مؤثر ہے، اور تاخیر کی صورت میں اقرار قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ کا اس امر پر اجماع ہے کہ شرب خمر کی حد کا اجراء اسی صورت میں ہوگا، جب کہ اس کا ثبوت اس حالت میں فراہم ہوا ہو، کہ مے نوش کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی ہو، کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے شرب خمر کی حد کے لیے یہ شرط عائد کی کہ شارب خمر (مے نوش)

لہ بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۴۷، ۵۱، ۱۲ - مصر۔

فتح القدیر جلد ۴، ص ۱۱۲، ۱۶۴ - مصر۔

الزیلعی تبیین الحقائق جلد ۳، ص ۱۸۸ - وما بعد۔

ابو زہرہ: العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، ص ۴۴، وما بعد مصر۔

الدکتور ابو المعاطی حافظ ابو الفتوح: النظام العقابی الاسلامی ص ۲۵۹، وما بعد۔

کو اس حالت میں لایا جائے کہ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی ہو، اور ظاہر ہے کہ مے نوشی کے اقرار میں تاخیر کی صورت میں وقتِ اقرار مے نوش کے جسم اور اس کی عقل سے تمام اثرات زائل ہو چکے ہوں گے۔

اس مقام پر یہ ضروری ہے کہ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کی رائے بھی ذکر کر دی جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شہادت اور اقرار ہر دو کی تاخیر سے جرائم حدود ساقط ہو جائیں گے، کیونکہ ان سخت سزاؤں سے اسلام کا مقصود یہ ہے کہ مجرم جرم سے باز آجائے اور افراد معاشرہ کو تنبیہ ہو اور یہ ردع اور انزجار کا مقصود اس وقت حاصل ہوتا ہے جب جرم کا اثبات فوری ہو اور اس کی سزا علی الفور جاری ہو اور تاخیر شہادت یا اقرار سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا، جب کہ اقرار میں تاخیر کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجرم نے خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کر لی ہو اور اس نے عدالت کے سامنے اقرار اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے کیا ہو۔

امام ابن لیلیٰ کی یہ رائے تعمق کی حامل ہے کیونکہ فقہائے کرام نے توبہ کو مانع سزائے حد قرار دیا ہے [1]

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ تقادم کی وہ صورت ہے جب کہ تاخیر شہادت کی بنا پر یا تاخیر اقرار کی بناء پر جرمِ حد کے اثبات میں تاخیر ہو جائے۔ اب رہ گئی تقادم کی یہ صورت کہ جرم کا اثبات ہو چکا ہو اور عدالت سزائے حد کا فیصلہ سنا چکی ہو، اس کے بعد کسی بھی وجہ سے سزائے حد کے نفاذ میں تاخیر ہو جائے تو کیا یہ تقادم بھی نفاذِ سزا پر اثر انداز ہو گا۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، اور امام محمد رحمہم اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محکوم علیہ پر سزائے حد کے نفاذ میں تاخیر بھی اقامت حد سے مانع ہو گا۔

امام ابن الہمام فرماتے ہیں:۔

"جس طرح ابتداً تقادم قبولِ شہادت سے مانع ہے، اسی طرح فیصلے کے بعد تقادم اجرائے سزائے حدّ سے مانع ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی پر حدِ جلد جاری ہو

---

[1] ابوزہرہ العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۴۸

رہی ہو اور وہ دورانِ ضرب بھاگ جائے پھر ایک مدت گذرنے کے بعد پکڑا جائے تو اب وہ بقیہ حد پوری نہیں کی جائے گی۔ یہی رائے ائمہ ثلاثہ کی ہے جب کہ امام زفرؒ کی رائے یہ ہے کہ تقادم درا جرائے حد، مانع سزا نہیں ہے۔[1]

مندرجہ بالا بیان حدود اور تعزیرات کے جرائم اور ان کی سزاؤں پر تقادم کے اثر انداز ہونے کے بارے میں تھا۔

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ دیوانی معاملات پر تقادم کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ دیوانی معاملات میں حق العبد موجود ہوتا ہے اور حق العبد تاخیر سے ساقط نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہاں پر بلا عذر وقت گذر جانے کی بنا پر دعوی عدالت کے لیے قابلِ سماعت نہیں ہوگا یعنی تقادم صاحبِ حق کے حق کو باطل نہیں کرے گا، محض عدالت کے لیے ایک مانع ہوگا کہ وہ دعوٰی نہ سُنے جب کہ صاحبِ حق کا حق باقی رہے گا، چنانچہ اگر مدعا علیہ خود ہی اس حق کا اقرار کرلے تو اس پر اس حق کی ادائیگی لازم ہو جائے گی۔

اگر تقادم سے حقِ عبد بھی باطل ہو جاتا تو اس صورت میں مدعا علیہ کے اقرار سے بھی اس پر حق کی ادائیگی لازم نہ ہوتی۔[2]

مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۱۶۶۰ قرض و دِیت، جائیداد میراث اور دیگر معاملات دیوانی میں پندرہ سال مدت گذر جانے کو تقادم مانع سماعت دعوٰی قرار دیتی ہے۔[3]

دفعہ ۱۶۶۱ متولی کے اور اصل وقف سے متعلق ملازمین کے ۳۶ سال کے بعد دعوٰی کو ناقابلِ سماع قرار دیتی ہے۔[4]

مرورِ زماں جو سماع دعوٰی سے مانع ہے وہ مرورِ زمانہ ہے جو بلا عذر ہو لیکن

---

[1] فتح القدیر ، ج ۴ ، ص ۱۶۳ مصر
الجزیرہ ، فلسفۃ العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۴۹۔
[2] سلیم رستم باز اللبانی شرح المجلۃ ص ۹۸۳ طبع ثالثہ بیروت
[3] ایضاً ص ۹۸۳ [4] ایضاً ص ۹۸۶۔

جو زمانہ عذر شرعی کے ساتھ گذرا ہو وہ سماعتِ دعوٰی میں مانع نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ مدعی صغیر (کم سن) ہو، یا مجنون ہو، یا وہ مدت سفر کے برابر دور کے شہر میں ہو، یا معتوہ (فاترالعقل) ہو خواہ اُس کا کوئی وصی ہو یا نہ ہو یا اُس کا مدِمقابل (خصم) غالب طاقتور ہو، تو اس مدت (عذر) کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ مرور زمانہ کی تاریخ اس عذر کے ازالہ کے بعد سے شروع ہوگی مثلاً اُس زمانہ کا اعتبار نہیں ہوگا جو بچہ کا بلوغ سے پہلے گذرا ہے بلکہ بلوغ کے بعد کے زمانے کا اعتبار ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا دعوی ... غالب طاقتور شخص سے متعلق ہو اور اس کے تغلب کی وجہ سے مرور زمانہ ہو جائے تو یہ مرور زمانہ سماع دعوٰی سے مانع نہیں ہوگا، بلکہ مرور زمانہ کا شمار اس تغلب کے ختم ہو جانے کے بعد سے ہوگا۔"

یہ اعذار شرعی جو مذکورہ دفعہ میں بیان کیے گئے ہیں تین قسم کے ہیں:۔

پہلی قسم	قاصریت	یعنی اگر صاحب حق صغیر یا مجنون وغیرہ ہو۔
دوسری قسم	غیاب	مدعی یا مدعا علیہ کا غائب ہونا۔
تیسری قسم	تغلب	مدعا علیہ کا صاحبِ قوت ہونا جو مدعی کو اس پر دعوٰی کرنے سے باز رکھے۔

اعذار کی موجودگی میں اگر تقادم (مرور زمانہ) ہو جائے تو یہ دعوٰی کی سماعت سے مانع نہیں ہوگا بلکہ تقادم (مرور زمانہ) کی مدت اس عذر کے ... نع ہونے کے بعد شروع ہوگی [1]

مدت تقادم کے بارے میں بھی فقہا کے مابین اختلاف موجود ہے۔ چنانچہ جامع صغیر میں ہے کہ مدت چھ ماہ ہے، امام محمد رضی اللہ عنہ سے ایک ماہ کی مدت کی بھی روایت ملتی ہے جو کہ امام ابوحنیفہؒ اور ابویوسفؒ سے بھی مروی ہے کہ قاضی خاں نے کہا کہ مدت تقادم ایک ماہ یا اس سے زائد ہے۔

راجح قول یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تقادم کی کوئی مدت متعین نہیں کی، چنانچہ امام ابویوسفؒ

---

[1] علی حیدر، دارالحکام شرح مجلۃ الاحکام کتاب ۱۲، ص ۲۶۸، ط بیروت۔

سے مروی ہے کہ ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے تحدید مدت کے لیے کہا تو انہوں نے انکار فرما دیا۔[1]

بہر حال اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی رائے یہی ہے کہ تقادم کی کوئی مدت متعین نہ کی جائے اور اس کو قاضی (عدالت) کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔[2]

البتہ حد خمر میں مدت تقادم اس کی بُو کا دُور ہو جانا ہے۔[3]

علی علی منصور نے جرم زنا کے سقوط کی حد وقوع جرم سے اقرار تک دس سال متعین کی ہے اور سقوط سزائے رجم کی تیس سال اور سقوط سزائے جلد کی دس سال قرار دی ہے۔[4]

جرم قذف کے سقوط کی تین سال اور سقوط حد قذف کی پانچ سال قرار دی ہے۔[5]

اور جرم سرقہ کے سقوط کی حد تین سال قرار دی ہے۔[6]

مجلہ میں دیوانی معاملات میں تقادم کی مدت کی مختلف تحدیدات کی گئی ہیں۔ جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ ہر مقدمہ کی نوعیت کے لحاظ سے عدالت کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ایک خاص مقدمہ میں تاخیرِ شہادت یا تاخیرِ اثبات کی مدت اتنی طویل ہے کہ یہ جرم یا اس کی سزا پر اثر انداز ہونے کے لیے کافی ہے۔

اس مقالہ کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظریہ تقادم سے متعلق چند اہم نکات بطور تلخیص بیان کر دیے جائیں۔

۱۔ کتاب و سنت کی ایسی کوئی واضح نص قطعی موجود نہیں ہے جس سے صراحتاً یہ معلوم ہو

---

[1] احمد فتحی، ...... : العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۲۲۳، مصر۔
عبدالعزیز عامر: التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ، ص ۵۲۵، مصر۔

[2] التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ، ص ۵۲۵ - البدائع جلد ۷، ص ۴۷۔

[3] احمد فتحی: العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۲۲۳ مصر

[4] علی علی منصور: نظام التجریم والعقاب ص ۲۴۵۔

[5] ایضاً ص ۲۹۰ [6] ایضاً ص ۱۳۳۔

کہ شہادت میں تاخیر جرائم حدود و تعزیرات پر یا ان کی سزاؤں پر اثر انداز ہوتی ہے ، ماسوا اس اثر کے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :۔

" ایما شہود علی حد لم یشہدوا عند حضرتہ فانما شہدوا علی ضغن فلا شہادۃ لہم "

جو گواہ کسی ایسی حد کی گواہی دیں جس کی گواہی انہوں نے وقت وقوع جرم نہیں دی تو یہ شاہد بربنائے ضغینہ شہادت دینے والے ہیں۔

مگر یہ اثر حضرت حسن سے مرسلاً مروی ہے اور مراسیل حسن قوی نہیں ہیں[1]

۲ ـــــ تقادم کے جرائم اور ان کی سزاؤں پر اثر انداز ہونے کے بارے میں فقہی اختلاف جرائم حدود اور ان کی سزاؤں میں ہے ، تعزیرات میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور باتفاق فقہاء اگر عدالت کسی بھی تعزیر کے اثبات میں تقادم کے مطابق مصلحت متصوّر کرے تو جرم کو یا سزا کو ساقط کر سکتی ہے ۔اسی طرح دیوانی معاملات میں بھی تقادم دعاوی پر اثر انداز ہوگا۔

۳ ـــــ اصولاً تاخیر شہادت شاہد کے بارے میں ضغینہ (عداوت) کا شبہ پیدا کرتی ہے۔ چونکہ حدود شبہات سے ساقط ہوتے ہیں ۔اس لیے اس شبہ سے بھی حد ساقط ہو جائے گی اور اس بات کا تعین کہ تقادم نے مظنۂ ضغن (گمان عداوت) پیدا کیا ہے یا نہیں ، عدالت ہی کر سکتی ہے ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عدالت کسی معاملہ میں تقادمِ شہادت کو شبہ متصوّر نہ کرے تو اسے یہ استحقاق حاصل ہے ۔ کیونکہ بنیادی طور پر ہر طرح کے شبہ کا تعین عدالت ہی کا کام ہے ۔

۴ ـــــ جو تقادم سقوطِ حد کا حامل بنتا ہے وہ ہے جو بلا عذر ہو ، اگر عذر موجود ہوگا تو تقادم نہیں ہوگا ، اور اس سے جرائم حدود و تعزیرات پر یا دیوانی مقدمات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۵ ـــــ حقِ عبد پر تقادم اثر انداز نہیں ہوتا اس وجہ سے تقادم کا حد قذف پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔کیونکہ فقہاء کے نزدیک اس میں حق العبد موجود ہے اور امام شافعیؒ نے کہا کہ یہ خالص

---

[1] ابو لیعلی الاحکام السلطانیہ ص ۲۴۸ ۔

حق العبد ہے یعنی قذف میں حق اللہ کی وجہ سے حق العبد کمزور نہیں پڑتا بلکہ تاخیر کے باوجود شہادت اور اقرار دونوں قابل سماع ہوں گے۔ کیونکہ قذف میں حق العبد یہ ہے کہ اس کی عزت پر جو حرف آیا ہے وہ مٹایا جائے جو اس صورت میں مٹے گا کہ قاذف کو شریعت کی مقرر کردہ سزا دی جائے[1] جب کہ جرم سرقہ میں حق العبد اس کا وہ مال ہے جو چوری ہوا ہے اس لیے تقادم سے حد تو ساقط ہو جائے گی مگر مال مسروق کی ادائیگی میں مانع نہیں ہو گا، بلکہ چور پر حد یا تعزیر کے ساقط ہونے کے باوجود بھی مسروق منہ کا مال واپس کرنا لازم ہو گا۔

۶۔ قانون ساز ادارے مختلف مقدمات میں تقادم کی مدت متعین کر سکتے ہیں مگر میرے خیال میں علی منصور نے اور المجلہ نے جو مدتیں متعین کی ہیں وہ بہت طویل مدتیں ہیں اور ان سے شریعتِ اسلامیہ کے فوری اور مؤثر انصاف کی روح متاثر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ حدود و تعزیرات میں اور دیوانی معاملات میں تقادم کی مدتیں متعین نہ کی جائیں۔ بلکہ اس مسئلہ کو عدالت کی صوابدید پر چھوڑا جائے کہ وہ ہر انفرادی مقدمے میں جدا جدا یہ فیصلہ کرے کہ اس میں تقادم ہوا ہے یا نہیں، اور بعد ازاں یہی عدالتی نظائر آئندہ مقدمات میں تقادم کی مدت کے فیصلے میں کام دیں گے۔ کیونکہ حالات و مسائل بدلتے رہتے ہیں اور ہر مقدمہ کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے اور اس مخصوص نوعیت کی روشنی میں عدالت بہتر طور پر مدتِ تقادم کا فیصلہ دے سکتی ہے۔

۷۔ تقادم کا مسئلہ اجتہادی نوعیت کا حامل ہے اور حالات و ضروریات کے پیش نظر اس میں کافی اجتہاد کی گنجائش موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تقادم کے تمام پہلوؤں کو بصورت دفعات از سرِ نو مدوّن کیا جائے اور اس کو جدید قوانین کے مماثل بنا کر پیش کیا جائے تاکہ فقہ و قانون کی دنیا میں اس کی عملی افادیت اجاگر ہو سکے اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ کی پیش رفت میں معاون ہو سکے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

---

[1] ابو زہرہ الجریمہ والعقوبہ فی الفقہ الاسلامی ص ۵۴

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں جن باکمال مشاہیر نے دنیا کے علم و فضل میں نام روشن کیا۔ ان میں علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی شخصیت بہت نمایاں اور ممتاز شخصیت رکھتی ہے۔ علوم و فنون کی جامعیت اور مہارت میں اُن کی نظیر نہ صرف اُن کے معاصرین علماء میں مفقود ہے بلکہ بعد کی صدیوں میں بھی خال خال ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ جو مہارت فنی، باریک بینی، نکتہ سنجی، دقیقہ رسی اور ذکاوت و فطانت میں حافظ عسقلانیؒ کی ہم پلہ ہوں۔

نام و نسب احمد نام، ابوالفضل کنیت اور شہاب الدین لقب تھا۔ پورا نسب نامہ یہ ہے:۔ احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن محمود بن احمد بن حجر الکنانی العسقلانی المصری[۱]۔

ابن حجر ان کے جد امجد تھے جیسا کہ نسب نامہ سے پتہ چلتا ہے اور آپ اپنے اس جد امجد کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اور آپ کے نام کے ساتھ عسقلانی اور مصری کی نسبت جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک زمانہ میں عسقلان فلسطین کا خوبصورت ترین شہر تھا۔ خوبصورتی اور حسن کی بنا پر اسے عروس شام کا خطاب دیا جاتا تھا۔

صاحب روضات الجنات نے تلخیص الآثار کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر بھی اسی شہر میں مدفون ہے[۲]۔ مصری کہلانے جانے کی وجہ یہ ہے کہ مصر ہی آپ کا مولد و منشا ہے،

۱؎ بستان المحدثین ص ۲۰۱ ۲؎ روضات الجنات ص ۹۴ ج ۱

تحصیلِ علم کے بعد اسی کے مختلف خطوں میں آپ کا قیام رہا۔ اور آخر اسی سرزمین میں پیوندِ خاک بھی ہو گئے۔

ولادت اور ابتدائی حالات ۲۳ شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے[1] صغر سنی ہی میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

"جب میرے والد فوت ہوئے تو میری عمر کے چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور آج مجھے وہ بالکل ایک خیال کی طرح یاد ہیں۔ اتنا یاد آتا ہے کہ انہوں نے کہا۔ میرے لڑکے (ابن حجر) کی کنیت ابو الفضل ہے"۔[2]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں: کہ حافظ ابن حجر کے والد کی کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ اسی شکستہ دلی میں ایک دن مشہور بزرگ شیخ صناقبری (یہ نام ناقابلِ فہم ہے۔ ادارہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے دعا کی اور فرمایا کہ تیری پشت سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو پوری دنیا کو علم کی دنیا سے مالا مال کر دے گا[3] حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی تصانیف کی اتنی مقبولیت اور شہرت حضرت شیخ صناقبری کی اسی دعا کا نتیجہ ہے[4]

حصولِ تعلیم ابتدائی تعلیم کا آغاز مصر سے کیا۔ سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ قرآن پاک کے حفظ میں آپ کے استاد شیخ صدر السفطی شارح مختصر التبریزی ہیں اور آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ اس لیے ۹ سال کی عمر میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔

آپ نے تحصیلِ علم کے لیے سفر کا آغاز ۷۸۴ھ میں کیا اور آپ نے تحصیلِ علم کے لیے جن ملکوں کا سفر کیا۔ ان میں حرمین شریفین کے علاوہ اسکندریہ، نابلس، رملہ، غزہ، یمن، قبرص، شام اور حلب وغیرہ شامل ہیں۔ اسی بنا پر آپ کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

---

[1] بستان المحدثین ص ۲۰۱

[2] الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۱۷

[3] بستان المحدثین ص ۲۰۲ [4] ایضاً [5] ایضاً

جیسا کہ ابن فہد مکی نے لکھا ہے۔

"ان کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کو نہ بیان کرنا ممکن ہے اور نہ شمار کرنا۔"[1]

یہ بھی حافظ ابن حجر کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کو اساتذہ و شیوخ کی ایسی منتخب جماعت میسّر آئی جس کا ہر فرد اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا۔

امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں۔

"انہوں نے شیوخ کی ایسی جماعت پائی، جس کا ہر فرد اپنے فن میں مشہور و ماہر تھا۔"[2]

اور حافظ سخاویؒ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے کہ انہیں اتنے شیوخ میسّر آئے جتنے اُن کے معاصرین میں سے کسی کو نہ مل سکے۔ اُن میں ہر فرد بحر العلوم اور اپنے فن میں ماہر و مشہور تھا۔[3]

اساتذہ و شیوخ حافظ ابن حجرؒ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے جیسا کہ ابن فہد نے لکھا ہے کہ ان کے شیوخ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا بیان و شمار ممکن نہیں۔

اِس لیے حافظ صاحب کے اساتذہ و شیوخ کی قطعی تعداد کا تعین مشکل ہے۔ تراجم و رجال کی مختلف کتابوں میں منتشر طور پر نام ملتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ حافظ صاحب کے شیوخ کے نام آپ کی تصنیف الدرر الکامنۃ لاعیان المائۃ الثامنۃ میں بھی ملتے ہیں، جن کا انہوں نے "شیخنا" کے لفظ سے ذکر کیا ہے تاہم آپ کے مشہور اساتذہ یہ ہیں:۔

۱۔ شیخ ابو محمد عفیف النشاوری (م ۷۹۰ھ) ۲۔ حافظ عمر بن علی بن احمد (م ۸۰۴ھ) ۳۔ امام ابو حفص عمر بن رسلان بن نصیر عسقلانی بلقینی (م ۸۰۵ھ)۔ ۴۔ حافظ عبد الرحیم الشافعی العراقی ۔ ۵۔ شیخ الاسلام ابو حامد محمد بن ظہیرۃ (م ۸۱۷ھ)۔ ۶۔ علامہ ابراہیم بن موسیٰ (م ۸۰۲ھ)

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۳۸۔

[2] البدر الطالع ص ۸۸ جلد ۱۔

[3] معارف جلد ص ۱۹۴۔

۷۔ امام ابو طاہر محمد بن یعقوب المجد الفیروز آبادی (م ۸۱۷ھ)[1]

حافظ ابن حجر کے یہ سب اساتذہ اپنے وقت کے شیخ، امام اور حجت تھے۔ علم و عمل کا بحر ذخار تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، ادب، لغت، تاریخ، صرف نحو، معقول و منقول میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ تبحر علمی کے ساتھ جہاد، بے نفسی اور صلاح و تقویٰ میں خاص مقام کے حامل تھے۔ عابد و شب زندہ دار تھے۔ اتقان، معرفت اور حفظ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

تلامذہ

حافظ صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ جس طرح آپ کے اساتذہ کی صحیح تعداد کا پتہ نہیں چل سکا، اسی طرح آپ کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ تاہم آپ کے مشہور تلامذہ یہ ہیں:۔

۱۔ امام محمد بن عبدالرحمٰن السخاویؒ (م ۸۳۱ھ) ۔ ۲۔ امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی (م ۸۰۹ھ) ۔ ۳۔ ابن فہد مکی (م ۸۱۲ھ) ۔ ۴۔ قاضی زکریا بن محمد الانصاری (م ۸۲۶ھ)

حافظ صاحب کے یہ تلامذہ بھی اپنے وقت کے امام اور صاحبِ فن تھے۔ یہ سارے بزرگ علم کا بحر ذخار تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، ادب، رجال، لغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جرح و تعدیل میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے تقریباً ۲۰ سال حدیث، فقہ اور قرآن کا درس دیا اور اس عرصہ میں آپ سے ہزاروں طلبا نے استفادہ کیا۔

تبحر علمی اور جامعیت

حافظ ابن حجر نے اپنے عہد کے تمام مشہور علمی مراکز اور یگانۂ روزگار فضلاء سے کسب فیض کیا تھا اور تحصیلِ علم میں غیر معمولی محنت کی تھی۔ اس محنت نے نہ صرف آپ کو اپنے عہد بلکہ تاریخ اسلام کا نامور عالم بنا دیا۔ چنانچہ آپ کو حافظ العصر، خاتمہ الحفاظ، امام الائمہ، محی السنۃ، علم الائمۃ الاعلام، فرید الوقت، مفخر الزمان اور عمدۃ المحققین کے خطابات سے نوازا گیا۔

حافظ ابن حجر کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ انہوں نے جس علم کی طرف توجہ کی اس کو درجۂ کمال

---

[1] الضوء اللامع جلد ۲ ص ۳۷۔

تک پہنچا دیا۔ امام ابن فہد لکھتے ہیں کہ "علوم کی تحصیل میں پوری محنت کی اور اس میں انتہا درجہ کی مہارت حاصل کی۔"[1]

چنانچہ آپ نے مختلف فنون مثلاً تفسیر، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، ادب اور لغت میں اپنا لوہا منوایا۔ اس کے بعد جب حدیث نبوی کی طرف توجہ کی تو اس میں امامت کا درجہ حاصل کیا اور اپنے شیوخ اور اساتذہ سے اجازہ و تدریس کے ساتھ تحسین و آفرین کی سند حاصل کی۔[2]

یوں تو آپ جامع العلوم تھے ہی، لیکن آپ کے خصوصی علم حدیث، رجال اور فقہ تھے اور ان میں بھی حدیث سے آپ کو زیادہ شغف تھا۔ اور اس میں زیادہ ناموری حاصل کی۔

امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) لکھتے ہیں:-

"بعض کا قول ہے کہ (ابن حجر) فطری شاعر، ماہر محدث اور فقیہ بے بدل تھے، رجال کی معرفت اُن کا استحضار، اُن کے بلند و پست کی پہچان اور علل احادیث وغیرہ کی واقفیت اُن پر ختم ہو گئی۔"[3]

اور امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں کہ "اُن پر علم حدیث کا خاتمہ ہو گیا۔"[4] حافظ ابن فہد کی آپ کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ: "حفظ و اتقان میں ان کا کوئی جانشین نہ ہو سکا۔"[5] امام سیوطی کا قول ہے کہ "اُن کے عہد میں اُن کے سوا کوئی حافظ (مراد ہے حافظ حدیث) نہ تھا۔"[6]

سرعت قرادت | حافظ ابن حجر کی سرعت قرادت کے بعض ایسے محیر العقول واقعات منقول

---

[1] معارف جلد ۱۰۱ نمبر ۳ ص ۱۹۸

[2] اتحاف البلاد ص ۱۹۴

[3] البدر الطالع جلد ۱ ص ۲۷۱

[4] حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۵۳

[5] معارف ۳ جلد ۱۰۱ ص ۲۰۲

[6] نظم العقیان ص ۴۷

ہیں جن پر اس زمانہ میں یقین کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعات حافظ صاحب کے اکابر تلامذہ سے متواتراً منقول ہیں۔ اس لیے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن فہد لکھتے ہیں:۔

"آپ نے بخاری شریف ظہر و عصر کے درمیان دس مجلسوں میں ختم کی، اور مسلم شریف ڈھائی دن میں اور نسائی شریف دس مجلسوں میں ختم کی۔ معجم صغیر للطبرانی ظہر و عصر کے درمیان ایک مجلس میں ختم کی"[۱]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) اور مولانا سید نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) نے لکھا ہے کہ "آپ نے سنن ابن ماجہ کو چار مجلسوں میں ختم کیا"[۲]

ذوقِ شعر و سخن حافظ ابن حجر کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و سخن سے خاص شغف تھا۔ اور انہوں نے اپنی فطری ذہانت کی بنا پر اس فن میں پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ علمائے کرام نے آپ کے ذوق شعر و سخن کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں!

"شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی تو اس میں بھی پوری مہارت حاصل کر لی اور کثرت سے بہت عمدہ نظمیں کہیں"[۳]

دیوان ابن حجر کے نام سے ان کا مجموعہ کلام بھی موجود ہے، جس میں ہر صنفِ سخن کے الگ الگ اشعار ہیں۔ یہ دیوان سات اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ نبویات[۱]، ملوکیات[۲]، اغوانیات[۳]، غزلیات[۴]، اعراض[۵]، موشحات[۶]، تقاطیع[۷]۔[۴]

آغازِ دیوان میں مدحِ رسولؐ میں ایک طویل قصیدہ ہے، جس میں صحیح بخاری کے ختم کا بھی

---

۱ معارف جلد ۱۰۱ نمبر ۳ ص ۲۰۲

۲ بستان المحدثین ص ۱۱۳ و اتحاف النبلاء ص ۱۹۳

۳ نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۴۵

۴ اتحاف النبلاء ص ۱۹۴

ذکر ہے۔ اس دیوان کا ایک نسخہ بھوپال میں حضرت والا جاہ محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی رئیس بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) کے کتب خانے میں موجود تھا۔

خاکساری و فروتنی لیکن با ایں ہمہ تبحر علمی و جلالت، شانِ فروتنی اور تواضع کا پیکر تھے۔ اہلِ علم کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اپنی رائے پر اصرار نہ تھا۔ اگر بحث میں حق واضح ہو جاتا تو اُس کو بلا تأمل قبول کرتے اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے[۱]

منصب قضاء حافظ ابن حجر نے قضاء کی آزمائشوں میں مبتلا ہونے کا شروع سے عزم کر لیا تھا۔ لیکن حکومت کی طرف سے شدت سے دباؤ ڈالا گیا تو آپ منصب قضا قبول کرنے پر راضی ہوئے اور آپ کی منصب قضا قبول نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں بہت سی مشکلات اور آزمائشیں تھیں جیسا کہ آپ کے تلمیذ رشید حافظ سخاویؒ لکھتے ہیں۔

"وہ قضاء سے بہت دامن بچاتے تھے، کیونکہ اس میں بڑی مشکلات اور آزمائشیں ہیں"[۲]

آپ کئی بار منصب قضا پر مامور ہوئے۔ حافظ ابن فہد مکی نے اس کی تفصیل یوں لکھی ہے

"حافظ ابن حجر سب سے پہلے ۸۲۷ھ میں قاضی القضاۃ کے منصب پر مامور ہوئے اور اسی سال ذیقعدہ میں اس سے گلو خلاصی حاصل کر لی۔ پھر رجب ۸۲۸ھ کو دوبارہ اس منصب پر فائز ہوئے، اور ۸۳۳ھ تک رہے۔ پھر اس کو چھوڑ دیا۔ جمادی الاولیٰ ۸۳۴ھ میں تیسری بار، شوال ۸۴۱ھ میں چوتھی بار، محرم ۸۵۰ھ میں پانچویں بار اور ربیع الثانی ۸۵۲ھ میں چھٹی بار قاضی ہوئے۔ درمیانی کچھ وقفوں کو چھوڑ کر ۸۲۷ھ سے ۸۵۲ھ تک برابر اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے اور جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو ہمیشہ کے لیے سبکدوشی حاصل کر لی۔ آپ

---

[۱] فتح الباری جلد ۱ ص ۲

[۲] الضوء اللامع جلد ۲ ص ۳۸

آپ کے منصب قضاء کی مدت ۲۱ سال بنتی ہے اور اس مدت میں آپ کے ذریعہ عوام کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ہزاروں حقداروں کو آن کا حق ملا[1]

ابن حجر کا مسلک مشاہیر علماء و ائمہ میں خاصی تعداد شوافع کی ملتی ہے۔ اس کا تاریخی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ نے (م ۲۰۴ھ) قیامِ مصر کے دوران اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی، جس کے لیے انہیں قربانی بھی کرنا پڑی۔ امام شافعیؒ کے حلقہ درس سے جو فضلاء نکلے انہوں نے درس و افادہ کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کے بعد چونکہ مصر کے بیشتر شیوخ و اساتذہ شافعی المسلک ہوتے۔ اس لیے آن کے تلامذہ اپنے شیوخ کے تبحر علمی اور دوسرے کمالات سے متاثر ہو کر اسی مسلک کو قبول کرتے تھے۔

اور اس طرح مصر میں شافعیؒ مذہب کی اشاعت کے قدرتی اسباب پیدا ہو گئے جو دوسرے ملکوں کو میسر نہ آسکے۔ اسی لیے مصر کے بڑے بڑے شیوخ شافعی المسلک ہی ملتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر کے اکابر شیوخ اور تلامذہ کی غالب تعداد شوافع ہی کی نظر آتی ہے۔ اور طبعی طور پر حافظ صاحب بھی متشدد شافعی تھے، بلکہ آن کا تشدد تعصب کی حدوں میں داخل تھا۔

حلیہ حافظ ابن حجر کے تلمیذ امام سخاوی نے حافظ صاحب کا جو حلیہ تحریر کیا ہے وہ یہ ہے:۔

"روشن چہرہ، دبتا ہوا قد، سفید ڈاڑھی، بڑا سر، نحیف الجثہ، فصیح اللسان، بلند آواز اور نہایت ذکی و ذہین تھے۔"[2]

وفات ۲۸ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو شنبہ کے دن بعد نماز عشاء قاہرہ مصر میں علم و عمل کا یہ آفتاب غروب ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۹ سال ۴ ماہ ۱۰ دن تھی۔[3] ان کے جنازہ میں اتنا جم غفیر تھا کہ شاید ہی کسی اور کے جنازہ میں اتنے آدمیوں نے شرکت کی ہو۔ ابن فہد مکی لکھتے ہیں۔ آن کی نماز جنازہ میں بہت عظیم مجمع تھا۔ نماز جنازہ میں سلطان ظاہر چقمق اور اس کے درباریوں نے بھی شرکت کی۔ امراء و روسائے دربار ان کی لاش کو کندھا دینے والوں میں شامل تھے۔[4]

حافظ عسقلانی کثیر التصانیف تھے۔ ان کی کتابوں کے بیان کے لیے مستقل مقالہ درکار ہے۔

---

[1] معارف نمبر ۳ جلد ۱۰۱ ص ۲۰۸ — [2] فتح الباری جلد ۱ ص ۴

[3] الجد العلوم ص ۸۵، — [4] معارف جلد ۱۰۱ نمبر ۴ ص ۲۶۲

مطبوعات

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ۔ ناشر: صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا، نشتر روڈ، کراچی ۔ قیمت: -/۳۰ روپے ۔

کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنے میں صاحبِ کتاب کی شخصیت اور خدمات بھی اہم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیقی و تصنیفی دائرے میں متعدد حاصلِ محنت پیش کیے ہیں۔ یہ اُن کے تبحر علمی کے ساتھ شریعت اسلامی سے اُن کی محبت اور قانون کے معاملات میں ان کی مہارت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ قیمتی شخصیت خوش قسمتی سے اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی کے مقام تک پہنچی، مگر اس پابندِ ایمان و ضمیر آدمی کا کام شاید بیوروکریسی کو پسند نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے زیرِ اہتمام ہونے والے کام کو پبلک کے سامنے لائے بغیر یکایک انہیں چلتا کر دیا۔

یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی ان ۴۶ تقاریر کا مجموعہ (حصہ اوّل) ہے جو متذکرہ عنوان سے ریڈیو پاکستان لاہور سے ۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۰ء کے دور میں نشر ہوتی رہیں۔ اور عوام میں مقبول ہوئیں۔

ہماری سفارش ہے کہ اس کتاب کو تعلیم یافتہ عوام کے علاوہ نوجوانوں میں پھیلنا چاہیے۔ اور ملک کی لائبریریوں میں رکھا جانا چاہیے۔

دعوت نئی دہلی کا "اجتماع نمبر" قیمت دس روپے ۔ ہفت روزہ سائز کے ۲۰۲ صفحات باریک طباعت ۔

حیدر آباد دکن سے آٹھ میل کی دوری پر ایک بے آب و گیاہ میدان پہاڑی چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ "وادیٔ الہدیٰ" کو جماعت اسلامی ہند کے اہلِ جنون نے تین روز کے لیے زندگی

سے بھر دیا۔ یعنی یہ فیصلہ کیا کہ اس جنگل میں چھٹے کل ہند اجتماع کا منگل منایا جائے۔ ایسا فیصلہ کرنا اصلاً اللہ پر بھروسے کی روشن مثال اور خود اعتمادی کا ایک مؤثر مظاہرہ ہے۔ وادیٔ بے آب و گیاہ میں اہلِ عزم کا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اس ویرانے میں چٹانوں کا کاٹنا، زمین کو ہموار کرنا، قیام گاہیں تیار کرنا، پانی اور رسد کا انتظام کرنا، ٹرانسپورٹ، فائر بریگیڈ، ہسپتال اور بنک کا بندوبست کرنا، بجلی، ڈاک، تار، ٹیلیفون کی فراہمی اور پھر تقریباً ایک لاکھ افراد کی طرح طرح کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری بہت بڑا چیلنج تھا۔ جسے جماعتِ اسلامی ہند نے اپنے سر لیا اور خدا کے فضل سے وہ اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئی۔ پندرھویں صدی کی تقریب کا بھی چونکہ موقع تھا اس لیے پندرہ محراب دار گیٹ بنائے گئے اور اُن پر خوبصورت انداز سے آیات، خاص شخصیتوں اور واقعات کا اندراج کیا گیا۔

سرکاری پولیس کا جو دستہ کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ اس کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "مجمع انتہائی باوقار اور نظم و ضبط کا پابند تھا۔ اور اس قدر کثیر حاضری کے باوجود کہ جس کی مثال شاذ ہی ملتی ہے پولیس کو کوئی شکایت ہلڑ بازی، غنڈہ گردی، چوری وغیرہ کی نہیں پہنچی۔ اور لوگ بغیر کسی پولیس مداخلت کے خود ہی لمبی لمبی قطاروں میں بسوں میں سوار ہونے کے لیے بنا سبے تھے اور ہم لوگ تو محض تماشائی بنے ہوئے تھے۔"

کے، سی کولیش مدیر روزنامہ راجستھان پتریکا نے لکھا کہ "حیدرآباد کا ماحول دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعتِ اسلامی ہند، ہندوستان کے مسلمانوں کی صحیح نمائندہ ہے اور بڑے پیمانے پر عظیم منصوبوں کو لے کر وہ کام کر رہی ہے۔"

ایک غیر مسلم ناظر نے وسعتِ انتظامات کو دیکھ کر کہا کہ "ایک جنگل میں ایسی بستی آباد کرنا یا تو جنوں کا کام ہو سکتا ہے یا فرشتوں کا!"

بیگم کیف لوگانوی کا پورا رپورتاژ بڑا مؤثر ہے۔ لکھتی ہیں: "تعریف کی بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں (والنٹیرز) نے کسی بھی خاتون کو دیکھ کر نہ آوازے کسے اور نہ کسی قسم کی بدتمیزی کی"۔ "یہ عظیم اجتماع اسلامی سیرت و کردار کا قابلِ قدر نمونہ تھا۔ نظم و ضبط، ڈسپلن، صبر و تحمل، ایثار و قربانی کے بہت سے نمونے دیکھنے کو ملے۔ معلوم ہوا کہ لوگ اپنے سٹالوں کو خالی چھوڑ کر نماز باجماعت میں

شریک ہو جاتے تھے"— "تقریروں کے دوران بار بار آنکھیں اشکبار ہوتی رہیں"—
"یہ یادگار اجتماع زندگی بھر یاد رہے گا"
خواتین کے نوجوان طبقوں کی طرف سے تاثر دیا گیا کہ کل ہند اجتماع نے ہمارے ذہن و فکر کو اسلام کے صحیح رُخ پر ڈال دیا ہے۔
خواتین کی سماعت گاہ اور بعض دیگر جگہوں کے لیے شارٹ ٹی۔ وی سرکٹس کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاکہ اسٹیج اور مقرر سب کو دکھائی دیتے رہے۔ کارروائی کو فلمانے کا انتظام بھی کیا گیا۔
اس موقع پر بارہ ۱۲ زبانوں میں تراجم قرآن کا اجرا عمل میں آیا۔ تمام اہم موضوعات اور سرگرمیوں کے متعلق خصوصی کمیٹیوں کے اجلاس ہوتے اور سب کی طرف سے حاصل بحث و نظر سامنے لایا گیا خطاطی، اعداد و شمار اور ڈیزائنوں پر مشتمل ایک دلکش نمائش بھی پیش کی گئی۔
غیر مسلموں پر اس اجتماع کے جو اثرات پڑے، اُن کے تحت بعض غیر مسلم حضرات نے قرآن حکیم اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعہ کی خواہش کی اور اُن کے کئی نسخے بھی طلب کیے۔ بعض ہندو اصحاب نے قرآن حکیم کی اسٹڈی کلاسز کا آغاز کر دیا ہے۔
رہی اجتماع کی اصل مرکزی کارروائی، یعنی خطبۂ صدارت، قیم کی سالانہ رپورٹ، اہم موضوعات پر بعض غیر ملکی شخصیتوں اور جماعت کے رہنماؤں اور دانشوروں کی تقاریر، نیز جملہ شعبہ ہائے کام کی تفاصیل، تو یہ چیزیں آپ دعوتِ اجتماع نمبر ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔
اس اجتماع نمبر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انتہائی مشکل حالات میں گھرے ہونے کے باوجود جماعتِ اسلامی ہند نے قرآن اور اس کی تفاسیر کو پھیلانے، دعوت اسلامی کو عام کرنے، خدمتِ خلق کی راہیں نکالنے، تعلیمی ادارے کھولنے، نشر و اشاعت کو وسیع کرنے، بلا سود بنکنگ کا کامیاب وسیع تجربہ کرنے اور غیر مسلموں میں کام کرنے کے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ بغیر اللہ کی خاص مدد کے اتنا کچھ ممکن نہیں ہے۔ شاید اس امر کی بھی برکت ہے کہ جماعتِ اسلامی کے امراء اور کارکن ایمان، تعلق باللہ اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے اچھے مقام پر ہیں۔
خدا اپنے ایسے تمام نیک بندوں کی مدد فرماتے جو اُس کی راہ میں خلوص سے کام کر رہے ہیں۔

ISSUES IN THE ISLAMIC MOVEMENT	مرتب: کلیم صدیقی - ناشر: دی اوپن پریس لمیٹڈ۔ 338 HOLLYBERRY TRAIL, WILLODALE,

ONT., CANADA M2H 2P6

کلیم صدیقی صاحب مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن سے متعلق ہیں۔ اور ادارتی مشاغل کے علاوہ تحریر و تقریر کے مزید دائروں میں بھی کام کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ مجموعۂ مضامین کریسنٹ انٹرنیشنل کے فائل (۸۱-۱۹۸۰ء) سے مرتب کیا ہے۔ مختلف اصحاب کی لکھی ہوئی یہ تحریریں ایک سال کے اُن حالات و واقعات کے آئینہ دار ہیں جو اسلامی تحریک (خصوصاً ایرانی انقلاب) سے متعلق نمودار ہوئے۔ بہ اشارۂ مرتب یہ مضامین ایسے صحافیانہ کالم نہیں ہیں جو ایک ایک کرکے نگاہوں سے گذر جاتے ہیں اور فراموش ہو جاتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسے بڑے واقعے کے تسلسل کے آئینہ دار ہیں، جو ہمارے سامنے تکمیل پا رہا ہے۔ لہٰذا یہ تحریریں اخباری نوعیت کے وقتی نوٹ نہیں ہیں، بلکہ ایک مستقل سرمایہ فکر ہیں۔ ان مضامین کے تین پہلو قابلِ توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ ان سب کا مرکز و محور ایران کا انقلاب ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے مغربی پروپیگنڈے کی نظر فریب ساحری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن، کریسنٹ انٹرنیشنل اور کلیم صدیقی اسلامی انقلاب کا اپنا ایک تصور رکھتے ہیں۔ اور اسی پر مبنی نقطۂ نظر سے احوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ کلیم صدیقی صاحب کا زاویۂ نگاہ پہلے سے قدرے زیادہ متوازن ہے۔

پڑھنے والوں کو اس مجموعے کے مندرجات یا اُن کے فکری پس منظر سے چاہے اختلاف ہوں، پھر بھی اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ہم اسلام و جاہلیت کے جس دَورِ کشمکش سے گذر رہے ہیں، اس میں حالات کو ہر زاویہ سے دیکھنا چاہیے۔

کاغذ، طباعت، ٹائیٹل، مغربی معیار کے مطابق بہت خوشنما۔

اُردو رسم الخط	از پروفیسر سید محمد سلیم - ناشر: مقتدرہ قومی زبان - ۴۳ ڈی، بلاک نمبر ۴ گلشن اقبال، کراچی ۴۷؎ - کاغذ، کتابت، طباعت، ٹائیٹل خوشنما، صفحات: ۹۸، قیمت غیر مجلد: -/۱۵ روپے

سید محمد سلیم میں دو خوبیاں ایسی جمع ہیں کہ وہ جو چیز لکھتے ہیں، دل و دماغ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ ان کی طبیعت میں ابداع و ایجاد کا رجحان بھی ہے اور تحقیقی معیار کا کام کرنے کا شوق بھی ۔ پیش نظر کتاب اس کی گواہ ہے۔ ہمارے لیے اس کے مباحث پر تفصیل سے کچھ لکھنا ممکن نہیں، ورنہ ہر باب پر گفتگو ہوتی ۔ مجملاً یہ کہ انہوں نے رومن اور عربی رسم الخط کے مقابلے میں اُردو رسم الخط کی فوقیتوں کو نمایاں کیا ہے ۔ آخر میں اُردو رسم الخط کے طباعتی اور قراءتی پہلو کو لیا ہے اور اس سلسلے میں مشکلات کو سامنے رکھ کر بعض تجاویز پیش کی ہیں جو غور و بحث کی دعوت دیتی ہیں ۔

چادر اور چار دیواری | مرتبہ الاستاذ منظہر علی ادیب ۔ ناشر: مکتبۃ السفیر، بنا مزنگ لاہور

صفحات : ۱۱۲ ، قیمت : ۷/۸۵ روپے

منظہر علی ادیب بہت وسیع النظر اور قادر الکلام ادیب ہیں ۔ انہوں نے اس مختصر کتاب میں اُس "مسئلہ زن" کو لیا ہے جو یوں تو مغربی تہذیب کی اثر اندازی کے بعد سے مسلسل زیر بحث رہا ہے، مگر خاص طور پر ان دنوں اس پر زیادہ توجہ ہے ۔ کیونکہ آزاد منش خواتین ہی نے اسے اُبھار دیا ہے ۔ اس وقت وہ یہ چاہتی ہیں کہ مغربی عورتوں کی طرح آزادی سے گھومیں پھریں، قانونِ حجاب کی کوئی پابندی نہ ہو، ہر کام مردوں کے ساتھ مل جل کر کریں، اُن کی ہاکی ٹیمیں ملک میں بھی کھلے بندوں میچ کھیلیں اور غیر ممالک میں جا کر بھی کمالات کا مظاہرہ کریں ۔ اس سے اگلا مرحلہ غالباً مقابلہ ہائے حُسن میں شرکت کا ہوگا ۔

جناب منظہر علی ادیب نے اسلامی شریعت کے احکام اور اسلامی تہذیب کی اقدار کی روشنی میں عورت کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں حوالوں اور مثالوں کے ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت کے نتائج بد کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ آخر میں انہوں نے جہیز کے متعلق ایک اصلاحی مضمون بھی شامل کیا ہے ۔

اُردو نامہ ادارت: سیّد منصور عاقل وشعیب بن عزیز۔ مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب سول سیکرٹری ایٹ، لاہور۔

یہ رسالہ مجلس زبان دفتری کا ترجمان ہے اور اس کے مندرجات سے اس کا مقصد ظاہر ہے کہ سرکاری دفاتر میں اُردو زبان کو رائج کیا جائے۔ شمارہ اوّل سامنے ہے۔ علامہ شبیر بخاری، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم اور پروفیسر اسمٰعیل بھٹی کے مقالات اس میں شامل ہیں۔ بعض موضوعات اہم ہیں مثلاً "وضع اصطلاحات کی ملی بنیاد"، "اصطلاحات اور اُن کی تفہیم" اور "تعلیم اور زبان"۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر نذیر احمد کے مختصر مگر مفید خیالات "اظہار خیال" کے عنوان سے دیے گئے ہیں۔

سائز بڑا ہفت روزوں والا۔ کاغذ سفید۔ طباعت اچھی، ٹائیٹل رنگین، صفحات ۴۰۔ قیمت فی شمارہ ۴/- روپے۔

نئی نسلیں ایڈیٹر: ابن فرید، انجم نعیم، م نسیم (مع ۵ رکنی مجلس ادارت)۔ دفتر اشاعت: شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ - قیمت فی شمارہ (۴۸ صفحات) تین روپے۔ سالانہ ۳۰/- روپے

اس ادبی رسالے کا مزاج تعمیر پسندانہ، مقصد فلاح انسانیت اور تہذیبی نقطۂ نظر خدا پرستانہ ہے۔ دسواں شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس رسالے کا وجود بھارت میں اُردو کی سخت جانی کا ثبوت ہے۔ چار مختصر افسانے شریک اشاعت ہیں۔ تین مقالات، طارق چھتاری کے ایک افسانے (تین سال) کا تجزیہ۔ ایک نعتیہ نظم (آزاد نظم) اور تین دوسری نظمیں (آزاد اور نثری نظمیں) شامل ہیں۔ ایک سفرنامہ ہے، کچھ تبصرے اور خطوط ہیں۔ اداریہ (اپنی باتیں) کے عنوان سے ہے۔ معروف لکھنے والوں میں سے ڈاکٹر احمد سجاد، سیّد اسعد گیلانی، پروفیسر عبدالسلام، صلاح الدین پرویز، ڈاکٹر وزیر آغا اور ابن فرید شریک محفل ہیں۔

اس رسالہ کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ اس میں غلط گھاٹوں کے ذریعے انسانیت کو بہکانے یا جنسی جنون میں از خود رفتہ ہو کر فحاشی کی گندگی پھیلانے کی جسارت کہیں نہیں کی گئی۔ بس پاکیزہ قسم کی ذہنی تفریح کا سامان ہے جو قارئین کو مسائل پر غور و فکر کرنے کی جانب مائل کرتی ہے۔

قواعدُ ہجاءِ القرآن از جناب شیخ التجوید قاری محمد شریف صاحب ۔ ناشر: مکتبۃ القراءۃ ، ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ صفحات: ۲۳۸ ۔ خوبصورت ٹائیٹل ۔ قیمت درج نہیں ۔

عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب فنِ ہجاء القرآن سے متعلق ہے ۔ حروف کو حرکات کی مدد سے جوڑ کر کیسے الفاظ تشکیل دیے جاتے ہیں اور اُن کی آوازیں کیا ہوتی ہیں ۔ اِس مقصد کے لیے اسباق کا آغاز حروف کی اشکال سے کیا گیا ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ تکمیلی مدارج کی طرف قدم بڑھتا ہے ۔ خاص بات یہ کہ بچوں کو تعلیم دینے کا طریقہ بھی اُستاد کو سمجھایا گیا ہے ۔ وہ کیا پڑھائے ، کتنا پڑھائے ، کیسے پڑھائے ۔ حتیٰ کہ امتحانات تک کے متعلق ہدایات ہیں ۔

حرکات کو کس طرح ادا کیا جائے ، اس کی دو مروج مثالیں کتاب میں دی گئی ہیں (ص ۵۷) ایک یہ کہ ہمزہ با زبر آبُ ، دوسری ہمزہ زبر با آب ۔ مؤلف نے پہلی صورت کو ترجیح دی ہے ۔ حالانکہ اگر دوسرا حرف ساکن نہ ہو تو اوّل الذکر قاعدہ نہیں چل سکتا ۔ مثلاً اَبَ کا جوڑ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہمزہ با زبر " آبُ " اور با زبر بَ ، اَبَ ۔ اس صورت میں دو حرکتوں کو بیان " با " کے ساتھ آتا ہے حالانکہ ایک حرکت ہمزہ کی ہے ، دوسری " با " کی ۔ اِسی طرح اگر لفظ " اَبَتِ " ہو تو پھر بھی ہر حرکت کو اس کے اپنے حرف کے ساتھ بیان کرنا ہوگا یعنی ہمزہ زبر اور با زبر اور تا زیر ۔ پس قاعدہ وہ صحیح ہے جو مختلف صورتوں میں چل سکے ۔

اصلاً یہ کتاب اساتذۂ تجوید ہی کے لیے لکھی گئی ہے ۔

معلم التجوید از جناب شیخ التجوید قاری محمد شریف ۔ ناشر: مکتبۃ القراءۃ ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

کتاب کا پورا نام روایتی طرز پر " معلم التجوید للمتعلم المستفید " ہے ۔ یہ کتاب مقدم الذکر کتاب سے آگے کی منزل کی ہے ۔ یعنی اس میں فن تجوید و ترتیل پر نہایت مفید کتاب بحثوں کے بعد مخارج حروف اور صفاتِ حروف پر گفتگو کی گئی ہے ۔ پھر تفخیم ، ترقیق ، اظہار ، ادغام ، اقلاب ، اخفا ، تسہیل ، ابدال ، حذف وغیرہ فنی مسائل کو واضح کیا گیا ہے ۔ تنوین ، غنہ ، ہمزہ ، مد وغیرہ کے متعلق ضروری نکات شامل ہیں ۔ آخر میں لحن اور اس کی قسموں کا بیان ہے ۔ خاتمہ میں آدابِ تلاوت قرآن ، استفادہ اور کے احکام اور ختم قرآن کا طریقہ درج کیا گیا ہے ۔ مگر ختم قرآن کے اس طریقہ کے ساتھ حدیث یا کسی دوسرے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ۔ حوالہ صرف دعائے ختم قرآن کا ہے ۔ قرآن کے متعلق کوئی طرزِ عمل سند کے بغیر لوگوں کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے ۔

(بقیہ اشارات)

چوتھا نکتہ احتساب یہ ہے کہ جب روزہ کا مرکزی مقصد تقویٰ کا حصول ہے تو روزہ دار کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ فسق و فجور کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے اپنے چشم و گوش کو بچائے جو چاروں طرف اُمڈ رہا ہے۔

سب سے بڑا فتنہ بے پردگی کا فتنہ ہے جیسے نمائش و آرائش کی وبا نے دو آتشہ کر دیا ہے اپنی نگاہوں کو اس ہجوم تماشا میں بچائے رکھنا، گندی اور فضول تصویروں سے دلچسپی نہ لینا، سینما کے پوسٹروں پر نظر نہ ڈالنا، اخبارات میں پیش کیے ہوئے ایسے جنسیت انگیز چہرے اور اشتہاروں کو آراستہ کرنے والے نسائی پوز نہ دیکھنا، ٹیلیویژن کے پردے پر جگمگانے والے چشم و لب سے دلچسپی نہ لینا کم سے کم روزہ دار کے لیے تو اشد ضروری ہے۔ اسی طرح فضول قسم کے گانے سننے اور خرافاتی ناول اور کہانیوں اور اشعار کے پڑھنے سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ صوت و رنگ کے یہ سارے کھیل آپ کے قلب میں ایسے بیج بو دیتے ہیں جن سے فوری طور پر خیالاتِ بد کی روئیدگی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی روک ٹوک نہ ہو تو بڑی تیزی سے جذبات و احساسات کے سارے آنگن میں خار دار بیلیں پھیل جاتی ہیں، جن پر نشہ آور بُو دینے والے رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ اس بُو کی سُلاتی ہوئی رو سے خود کو بچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو آدمی اس مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ خود اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا بلکہ اس کے دل میں نجات پانے کا ارادہ ہی نمودار نہیں ہو سکتا۔

گھر میں نظر ڈالیے، اگر غلط قسم کی تصاویر دیواروں پہ لگی ہوں یا فضول قسم کے ریکارڈ یا کیسٹ میز پہ یا دراز میں رکھے ہوں یا آپ کی الماری میں خرافاتی قصے کہانیاں موجود ہوں تو اس آلائش سے گھر کو پاک کیجیے تاکہ آپ کے چشم و گوش پاک رہیں اور نتیجۃً آپ کا قلب پاک رہے۔

فلم بینی سے، رقص گاہوں سے، مخلوط ثقافتی تقاریب اور دعوتوں اور دنیا فتنوں سے، نام نہاد کلچرل شوز سے، مینا بازاروں سے، قمار بازی کے اڈوں سے اپنے آپ کو دُور رکھیے۔

ورنہ صرف اتنا ہی نہیں کہ روزے کا مقصد ختم ہو جائے گا، بلکہ روزہ اپنے ساتھ تضاد رکھنے والے عوامل کے حملوں کا شکار ہو جائے گا۔

خوب سمجھ لیجیے کہ ملحدانہ افکار کے ساتھ ساتھ منشیات مے کے علاوہ بے پردگی اور نمائش حسن اور عریانی و فحاشی، ملحدانہ تہذیب کے خداوندوں کی طرف سے پھیلائی ہوئی ایسی وبائیں ہیں جن کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان مسلمان نہ رہے اور اسلامی ممالک کی اخلاقی فضا اس درجہ تباہ ہو جائے کہ اسلام کا ایک نظام بن کر ابھرنا غیر ممکن ہو جائے۔ مدت سے خلاف ایک مدت سے جاری یہ حملہ ایسا ہے کہ اس کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے کم سے کم نماز روزہ کے پابند مسلمانوں کو مضبوط موقف پر کھڑا ہونا چاہیے۔

ماہ رمضان مادیت اور مادہ پرستانہ تہذیب کے خلاف ایک مؤثر محاذ ہے جس کو مضبوط اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری خاص طور پر روزہ داروں پر عائد ہوتی ہے۔

اپنا احتساب کیجیے کہ آپ سمع و بصر و فواد کے اس محاذ پر کیا حصہ ادا کرتے ہیں!

پانچواں نکتۂ احتساب یہ ہے کہ روزہ اکیلی ایک عبادت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسری بہت سی عبادتیں جمع ہیں جیسے کہ صدقہ کی اہمیت کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ روزہ داروں کے لیے نماز کی ذمہ داری بھی عام حالات سے بڑھ جاتی ہے۔ خاص طور سے تراویح کا اضافہ بڑا ہمت آزما ہوتا ہے۔ دن بھر کے کچلے پسے ہوئے آدمی سے رمضان کا مطالبہ یہ ہے کہ افطار اور کھانے کے جلد ہی بعد عام دنوں سے زیادہ طویل نماز پڑھنے کے لیے حاضر ہو جائے۔ اضافہ پوری ۲۰ رکعتوں کا ہے (۸ رکعتوں والے مسلک کی گنجائش بھی اپنی جگہ درست ہے) پھر جسم کی ضرورت کے مقابلے میں بہت قلیل وقفۂ آرام کے بعد سحر خیزی اور سحری کھانے کے متصلاً بعد صبح کی نماز ایک ایسا سلسلۂ آزمائش ہے جو مہینہ بھر جاری رہتا ہے۔

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا آدمی نے پانچوں نمازیں بروقت اور باجماعت ادا کرنے کے علاوہ تراویح کا بھاری بوجھ بھی خوشی خوشی اٹھا لیا یا نہیں۔ اس پہلو سے ہر شخص کو اپنا احتساب خود کرنا ہے کہ وہ ساری نمازیں ادا کرے، کوشش کرے کہ نمازیں باجماعت ادا ہوں اور

مزید برآں وہ تراویح کی سنّت پر بھی پورا پورا عمل کرے۔
ماہ صیام اس لحاظ سے ماہ قیام بھی ہے۔ دن کو روزہ رکھیے اور رات کو عام دنوں سے زیادہ رکعتیں نماز کی پوری کرنے کے لیے قیام کیجیے۔

چھٹا نکتۂ احتساب یہ کہ رمضان جو نزولِ قرآن کا مہینہ ہے، کیا ایک روزہ دار اس میں اپنا تعلق قرآن پاک سے جوڑ کر ہدایت حاصل کرتا ہے یا نہیں؟ قرآن سے تعلق جوڑنے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ نماز تراویح میں پورا قرآن شریف سُنا جائے تاکہ اس ضابطۂ حیات پر ہر سال اجمالی نظر ہو جائے۔ بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں، بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے اور بہت سے احکام کی صحیح شکل سامنے آجاتی ہے۔ قرآن سے تعلق جوڑنے والے یہ بھی کرتے ہیں کہ قرآن کا جو حصہ آنے والی رات نماز میں پڑھا جانا ہوتا ہے یا گذشتہ رات پڑھا جا چکا ہو اُسے وہ گھر یا مسجد میں کسی وقت علیحدہ بیٹھ کر بغور پڑھتے ہیں کہ اجمالاً جو حقیقتیں سامنے آئی تھیں اُن پر خصوصی توجہ ہو جائے۔ اس کام کے لیے قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر صرف تلاوت بھی ہو تو تعلق بالقرآن کا وہ بھی ذریعہ بنتی ہے۔ اکثر مسجدوں میں صبح کی نماز کے ساتھ رمضان میں قرآن کا مختصر سا درس بھی ہوتا ہے مسجدوں کے علاوہ بھی افطار کے اجتماعات میں عصر سے مغرب تک درس کے انتظامات ہوتے ہیں۔
اس طرح کے درسوں میں شریک ہو کر روزہ دار قرآنی حقائق کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اچھے علماء کے ٹیپ کیے ہوئے درس سُنے جا سکتے ہیں۔ قرآن سے تعلق کے لیے ختم قرآن کی وہ مجالس بھی مفید ثابت ہوتی ہیں جن میں رمضان کے خاتمے کے قریب قرآن کے فضائل اور مسائل پر تقاریر ہوتی ہیں۔

اِن ساری چیزوں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ محبتِ قرآن کے علاوہ علمِ قرآن میں اضافہ ہو۔ یہی علم وہ علم ہے جسے ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔ علماء کی مجالس میں بیٹھنا، قرآن پڑھتے ہوئے اُس کے مطالب پر غور کرنا، تفاسیر کے ذریعے اُلجھنوں کو صاف کرنے کی سعی کرنا،

اور پھر جو اوامر و نواہی سمجھ میں آجائیں اُن کو سچے دل سے عملاً قبول کر لینا یہ ہے تعلق بالقرآن کا کمال۔

اور تعلق بالقرآن سے یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب ہدایت کی تعلیم، اس کے احکام، اس کے قوانین کا بول بالا ہو اور قرآن ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا عملاً ضابطہ بن جائے یعنی ہر روزہ دار غلبۂ قرآن کا علمبردار ثابت ہو۔ ہمارے اردگرد جو کچھ بھی خلاف قرآن سرگرمیاں اور مظاہر موجود ہیں وہ باقی نہ رہیں۔ قرآن سے سرکشی اور بغاوت بلکہ بے اعتنائی تک کی روش ختم ہو جائے۔ صحیح روزہ داری وہی ہے جو ہمیں قرآن سے اس درجے کی محبت دے اور غلبۂ قرآن کے لیے ایسا جذبۂ بے تاب عطا کرے۔

روزہ داری کے سارے ہی پہلوؤں میں اور خصوصاً تعلق بالقرآن کے بارے میں اعتکاف بہت ممد ہوتا ہے۔ اعتکاف میں بیٹھا ہوا آدمی گھر کے بکھیڑوں سے الگ ہو کر اور معاش کے مشاغل سے فارغ ہو کر قرآن کو زیادہ توجہ سے پڑھتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ یاد کر لیتا ہے، اس کے مطالب کو سمجھنے کے لیے کتابوں کی مدد سے کاوش کرتا ہے۔ اس طرح قرآن اس کے دل میں اپنی خاص جگہ بنا لیتا ہے۔

اب یہ تو خود روزہ دار کا کام ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیتا رہے کہ قرآن سے اس کا کس درجے کا تعلق قائم ہوا ہے؟ کتنی محبت اس کی تعلیمات سے پیدا ہوئی؟ کتنا حصہ اس کا سمجھا جا سکا؟ کونسے احکام ایسے سامنے آئے جن پر پہلے نظر نہ تھی؟ موجودہ زندگی میں کیا چیزیں ہیں، جو قرآن کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں؟ کیا کیا کچھ بدل دینا ہوگا؟ اجتماعی نظام قرآن سے کتنی دُور جا رہا ہے؟ ماحول میں کیا کیا آلائشیں قرآن کے خلاف موجود ہیں؟ نظامِ حیات کو قرآن کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کیا کام ہونا چاہیے؟ اس طرح کا کام کچھ اور لوگ کر رہے ہیں؟ اور کر رہے ہیں تو کیا وہ قابلِ اعتماد ہیں اور اُن کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے؟ کوئی دوسری قوت اگر موجود نہیں اور کسی کے ساتھ تعاون کرنے کا راستہ نہیں تو پھر بطور خود قرآن کا پیغام پھیلانے اور اس کے غلبہ کی تحریک اٹھانے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں ہر شخص کے اپنے سوچنے کی ہیں۔

احتساب کا ایک ساتواں پہلو بھی ہے۔

رمضان کو جس طرح قرآن سے نسبتِ خاص ہے، اسی طرح جہاد سے بھی گہرا رشتہ ہے[1]۔ اس وجہ سے کہ قرآن کی انقلابی تحریک کا ایک سرا اگر دعوت ہے تو دوسرا جہاد ہے۔ بلکہ بر درِ حقیقت اگر دیکھا جائے تو قرآن کی دعوت میں بھی جہاد کی رُوح شامل ہے۔ یعنی خدا کی توحید کو قائم کرنے کا پیغام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شرک کی تمام اقسام سے بیزاری اختیار کی جائے۔ اللہ سے ایمان کا رشتہ جوڑنا ہو تو طاغوت سے کُفر کیا جائے، معروف کو اگر پھیلانا ہو تو منکر کے انسداد کی کوشش کی جائے، اس طرح دعوت کے مثبت اور منفی دونوں پہلو جب سامنے ہوں تو پھر یہ حقیقت سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ قرآن کی دعوتِ حق کی رُوح جہاد ہے۔ جہاد صرف میدانِ جنگ میں قتال ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ باطل سے ٹکراؤ کی ہر شکل خواہ وہ فکری ہو، علمی، ادبی یا معاشرتی و ثقافتی جہاد کی تعریف میں داخل ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کی بہت سی اشکال اور بہت سی سطحیں ہیں۔

مزید یہ کہ جہاد کی آخری شکل، یعنی قتال فی سبیل اللہ کی تاریخ بھی ماہ رمضان سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اسلامی مملکتِ مدینہ کی تاریخ کا پہلا سریہ جس کا مقصد فوجی گشت تھا، رمضان ۱ھ میں واقع ہوا۔ اس کے علاوہ کم از کم سات مزید سرایا ہیں جو رمضان میں ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان پہلا معرکہ بدر کے مقام پر رمضان ۲ھ میں ہوا۔ اسی طرح آخری فیصلہ کن کارروائی فتح مکہ کی تھی جو رمضان ۸ھ میں عمل میں آئی۔ بعد کی تاریخِ ملت

---

[1] خود صوم کا اطلاق ایسے گھوڑوں پر ہوتا ہے جن کو عام معنوں میں سفر کے لیے اور خاص معنوں میں جہاد کے لیے دوڑا کر اور بھوکا پیاسا رکھ کر تربیت دی جا رہی ہو۔ اس مفہوم کے لحاظ سے روزے کا صحیح ترین تصور ہی مسلمان کے لیے یہ ہے کہ اسے جہاد کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ سو روزہ دار کو اس مقصود پر نگاہ رکھنی چاہیے۔

ہیں متعدد بڑے بڑے معرکے رمضان میں واقع ہوئے ۔اس وجہ سے رمضان ماہ جہاد بھی ہے۔ کم سے کم اس مہینے میں طاغوتی قوتوں کے خلاف جذبۂ جہاد کو نشو ونما پانا چاہیے۔

ہر روزہ دار کو اس لحاظ سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ آیا اس کے اندر سچا جذبۂ جہاد موجود ہے؟ جہاد کی مضبوط نیت اُس کے دل میں ہے؟ کیا اس میں شہادت کی تمنا ہے؟ کیا صبر کی صفت جو جہاد کی شرط لازم ہے، اُس نے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ وہ نظم اور ڈسپلن میں کسے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ اور دنیا میں جہاں کہیں مسلمان جہاد میں مصروف ہیں، اُن کے لیے اس کے دل میں سچی ہمدردی ہے؟ کیا وہ اُن کے لیے مالی ایثار کرتا ہے؟

اِس سے نیچے اُتر کر کیا وہ جبر کیش قوت کے سامنے حق وصداقت کی بات کہنے کا جذبہ رکھتا ہے کہ یہ بھی جہاد کی ایک اہم قسم ہے؟ کیا وہ رشتہ داروں اور دوستوں اور اہل وعیال کے سامنے ان کی پسند ناپسند کی پروا کیے بغیر دین کے تقاضے بیان کر سکتا ہے اور اُن کا واضح عملی مظاہرہ کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے لیڈروں اور اہلِ حل وعقد کو خلافِ دین یا خلافِ مصلحتِ دین امر پر ٹوک سکتا ہے؟

اگر ان چیزوں میں کمی ہے تو روزے کی برکات کی مدد سے ہر شخص کو پوری کرنی چاہیے۔

ان چیزوں کا لحاظ رکھے بغیر اگر روزہ بحالتِ غفلت رکھا جائے جب کہ نہ دلِ بیدار ساتھ ہو، نہ شعوری ایمان حرکت میں آئے، نہ روزے کے مقاصد سامنے ہوں اور نہ اُن مقاصد کی روشنی میں احتساب کیا جائے تو رمضان کی بے حساب برکات یوں ضائع ہو جاتی ہیں جیسے کسی شخص کے گھر کے سامنے سے مہینہ بھر ایک نہر بہتی رہے۔ مگر اُس کے گھڑے خالی اور صراحیاں سوکھی پڑی رہیں۔

خدا آپ کو تمام روزے نصیب کرے، جاگتے دل ودماغ کے ساتھ روزے، تراویح اور سحری کا اہتمام کیجیے اور ان تمام برکات کو سمیٹیے جو رمضان ساتھ لایا ہے۔

---

(۲)

لبنان میں فلسطینیوں کی بہیمانہ تباہ کاری کے لیے جو شرمناک کام درو ائی اسرائیل نے امریکہ کی پشت پناہی سے کی ہے، اس کے خلاف اپنی طرف سے کوئی نوٹ لکھنے کے بجائے یہاں میاں طفیل محمد صاحب کے بیان مورخہ ۲۰ رجون ۱۹۸۲ء کو درج کیا جا رہا ہے:۔

"فلسطینیوں کی تحریکِ آزادی کو کچلنے اور انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے اسرائیل نے جس بے خوفی و سفاکی کے ساتھ حملہ کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال افغانستان پر روسی فوج کشی کے سوا حال میں موجود نہیں ہے اور اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جو امریکہ بہادر افغانستان میں روسی جارحیت کی مذمت کرتا ہے وہی امریکہ لبنان پر اسرائیلی جارحیت کا پشت پناہ بنا ہوا ہے اور ہر وہ قرارداد جو اقوامِ متحدہ کے بین الاقوامی فورم میں اسرائیل کی مذمت کے لیے پیش کی گئی ہے، امریکہ نے اُسے اسی طرح ویٹو کر دیا ہے، جس طرح کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف پیش ہونے والی قراردادوں کو رُوس ویٹو کرتا رہا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نام نہاد مہذب دُنیا میں سیاست کی بنیاد طاقت ہی ہے، حق و انصاف ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ لہٰذا لبنان کے معاملے میں امریکہ کے طرزِ عمل اور افغانستان کے معاملے میں رُوس کے رویے سے اب عالمِ اسلام کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے انہیں اپنے ہی وسائل اور اپنی ہی قوت اور طاقت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ کوئی دوسرا سہارا انہیں کام نہیں دے سکتا۔ عجیب بات ہے کہ اس سانحۂ فلسطین و لبنان پر اسلامی کانفرنس تقریباً بے حس و حرکت بیٹھی ہے، حالانکہ جس طرح افغانستان پر رُوسی فوج کشی سے پیدا شدہ بحران پر صلاح مشورے کے لیے اسلامی کانفرنس کا خصوصی اجلاس فوراً طلب کر لیا گیا تھا، اسی طرح لبنان میں فلسطینیوں کے قتلِ عام کے سدِ باب کے لیے بھی اسلامی نہیں تو عرب ممالک کا اجلاس بلا تاخیر منعقد کرنا چاہیے تھا۔ اسرائیل صرف عام جارحیت ہی کا نہیں بلکہ نہایت ہی وسیع پیمانے پر قتلِ انسانی کے جرم کا مرتکب ہوا ہے اور عالمِ اسلام جب تک متحد ہو کر اپنی قوت کا مظاہرہ نہیں کرے گا اُس کی آواز صدا بصحرا ہی بنی رہے گی۔

میں عالم اسلام سے بالعموم اور عالم عرب سے بالخصوص اپیل کرتا ہوں کہ وہ مظلوم فلسطینیوں کی مدد کو پہنچیں اور ان کا قتلِ عام بند کروانے کے لیے اپنے تمام ممکن ذرائع کام میں لائیں۔ اگر ہر ملک کے مسلمان ہزار میں سے صرف ایک مسلمان رضا کار بھی فلسطین بھیجنے کا فیصلہ کر لیں تو صہیونیوں اور ان کی پشت پناہ قوتوں کا فلسطین اور اس کے نواح سے صفایا ہو سکتا ہے۔

لبنان پر اس تازہ اسرائیلی حملے کے نتیجے میں ان چھ روز میں ۳۰ ہزار سے زائد فلسطینی مسلمان شہید اور لاکھوں عورتیں، مرد اور بچے زخمی ہو چکے ہیں۔ (اور ان کے مکان اور ضرورت کے سامان بھی غارت ہو چکے ہیں — مدیر) آج ہر مسلمان اور صاحبِ دل انسان کا فرض ہے کہ شہداء کے پسماندگان اور زخمیوں کی ہر ممکن امداد کرے۔ تحریک اسلامی پاکستان، منصورہ، ملتان روڈ لاہور نے "امداد فلسطین فنڈ" کے نام سے امدادی فنڈ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم تمام اہلِ وطن سے اپیل کرتے ہیں کہ دل کھول کر اس میں امدادی رقوم جمع کرائیں۔ مرکز میں یہ رقوم ناظم فنڈ مذکور مسعود احمد خان یا ناظمِ اعلیٰ شیخ فقیر حسین کے نام بھیجی جا سکتی ہیں"۔

ضروری تصحیح

خدا سے ہم معافی چاہتے ہیں کہ پچھلی مرتبہ کے اشارات میں ایک آیت غلط چھپ گئی۔ صحیح یہ ہے

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ

(الانفال — ۲)

(ادارہ)

احباب متوجہ ہوں

مشہور اسلام پسند ادیب و شاعر جناب نعیم صدیقی مؤلفِ محسنِ انسانیت و ایڈیٹر، ماہنامہ سیارہ و ترجمان القرآن، لاہور، پر ایک خاص رُخ سے تحقیق کرنے کا ایک جامع منصوبہ سامنے رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُن خطوط کی بطورِ خاص ضرورت ہے جو محترم صدیقی صاحب نے احباب کے نام وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔

احباب سے التماس ہے کہ وہ جناب نعیم صدیقی صاحب کے خطوط (اصل یا فوٹو کاپی) درج ذیل پتہ پر، اپنی اولین فرصت میں ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

اشفاق احمد کاشف

معتمد، ادارۂ تحقیقات،

۳۸۔سی۔گلبرگ۔فیصل آباد

علماءِ دین! — علماءِ طب — بنئیے!!

—— اور ——

ایک باعزت، موثر اور مفید — ”ذریعہ معاش“ جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے —— اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

—— الحمد للہ ——

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طب کی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے —— اور

جامعہ طبیہ اسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور یا موقوف علیہ سے فارغ

ذہین طلبہ —— کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات

کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں

بلاتاخیر مع نقول اسناد اور مدرسے کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و

اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵ - جناح کالونی فیصل آباد